...س سے کم از کم یہ توظا... آواز بیکار نہیں گئی اور بعض

...تا ہے کہ انھیں میری
...س عقلوں اور تجربہ کار
...تھا علی الخصوص
...ت کا اعتراف
...ت کو کیوں

...م کرلیا
...ے میں کیا
...یں لیا تو کیا غلطی کی —
...وں کی محنت کا... میری موافقت پر اظہار بہی کرتے
...ت تو وہ خوف یا مصلحت سے ان "تجربہ کار ہستیوں" کی محنت کا
اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دبی زبان سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اصلاحات
اقتدار شاہانہ پر خراب اثر پڑتا ہے
...ت کے اشارہ پر غیروں کی نہیں، ہماری زندگیاں صدقہ ہونے کو
...نیاز کی نہیں ہماری گردنیں زیادہ زیب دیتی ہیں"۔
داد دیتا ہوں۔ اپنے مالک کی حمایت میں ان کو یقیناً یہی جذبہ
...ب معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اس جذبہ کے اظہار سے بھی
...یت کا صحیح اندازہ کیا ہے
... دکن کے وہ ہندوستان کے کسی باشندہ کو اس کا مستحق
...عقیدت کرے، گویا بہ الفاظ دیگر وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ
محدود ہیں۔ لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ بیرون دکن کے
...نار و قربانی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تو یہ اور زیادہ لغو و مہمل

...پندہ
...سالا
...نور

...چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
...نمبر بہ وجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ستمبر ۱۹۳۹ء	شمار ۳

...یٹر ---------- ۲
...یٹر ---------- ۹
...تش ---------- ۱۵
...ب چند ---------- ۲۶
...ق گورکھپوری ---------- ۳۳
...یٹر ---------- ۳۸
...یعقوب (بی، اے، ایل، ایل، بی) ---------- ۴۴
...یٹر ---------- ۵۲
...یٹر ---------- ۵۵
...یٹر ---------- ۶۱
...یٹر ---------- ۶۳
...یٹر ---------- ۶۵
...لدین، کاوش، عدم، فطرت، نجم ---------- ۶۹
...یٹر ---------- ۷۳

جلد ۳۶ | ستمبر ۳۹

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

شمارہ ۳

ملاحظات

"رہبرِ دکن" کے ایک گمراہ مقالہ نگار سے

حیدر آباد کے دستوری اصلاحات سے متعلق میرا ایک م
بعد کو روزنامۂ "پیام" حیدر آباد میں بھی شایع ہوا، اس پر ایک صاح
کیا ہے — ہر چند اس نوع کے غیر ذمہ دارانہ مقالوں کی طرف ا
بعض نہایت مکروہ و گمراہ کن اُصولی غلطیوں کا اظہار پایا جاتا ہ
رشید ترابی صاحب سے میں واقف نہیں ہوں، لیکن ان
اور خیالات کی ژولیدگی سے پتہ چلتا ہے کہ فن صحافت میں یہ اُن کا
بھی نہیں کہ واقعی اس کی ضرورت تھی بلکہ صرف اس لئے کہ بسا او
کا باعث ہو جاتا ہے

...الہ جو گزشتہ مہینے کے "نگار" میں شایع ہوا تھا اور جو
...ب رشید ترابی نے رہبرِ دکن میں کافی برہمی کا اظہار
...تنا، کرنا میرے اُصول کے خلاف ہے، لیکن چونکہ اسمیں
...ہے، اس لئے ان کا ازالہ ضروری ہے
...ی تحریر کی اُلجھن، مفہوم کے فقدان، مدعا کی نا استواری
...اولین قدم ہے اور انھوں نے یہ مضمون شاید اس لئے لکھا
...فات موافقت سے زیادہ کسی کی مخالفت کرنا اپنی شہرت

تاریخ اسلامی ہند
کتابی

تاریخ اسلامی ہند جو نگار میں جزاً جزاً جنوری
تھے چنانچہ اب وہ کتابی شکل میں طیار ہے وہ اصحاب ج
چاہتے ہیں، دنیز وہ اصحاب جو نگار کے خریدار نہیں ہیں
اور قیمت معہ محصول ۱۲؍ ہے -

بہر حال میں ان کی برہمی سے خوش ہوا کیونکہ اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہی ہو گیا کہ میری آواز بیکار نہیں گئی اور بعض مخالفین کو اس کی طرف سے "اندیشہ ہائے دور و دراز" پیدا ہونے لگے ہیں

ذاتیات سے قطع نظر کرنے کے بعد ترابی صاحب کے مضمون کو دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ انھیں میری بعض باتیں بہت ناگوار گزری ہیں مثلاً ایک یہ کہ جن اصلاحات کی رپورٹ انھیں کے الفاظ میں "دور رس عقلوں اور تجربہ کار ہستیوں" نے دو سال کی مسلسل محنت کے بعد مرتب کی ہے، ان پر مجھے رائے زنی کا کیا حق حاصل تھا علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ میں دکن کا باشندہ بھی نہیں، دوسرے یہ کہ میں نے شہریار دکن کی غیر معمولی خصوصیات کا اعتراف غیر ملکی ہو کر کیوں کیا اور تیسری بات جس نے ان پر تیز "نشتر" کا کام کیا، یہ ہے کہ میں نے مخالفین اصلاحات کو کیوں ناکارہ جماعت سے تعبیر کیا

امر اول کے متعلق مجھے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جب ترابی صاحب نے خود اس بات کو تسلیم کر لیا کہ اصلاحات نتیجہ ہیں "دور رس عقلوں اور تجربہ کار ہستیوں" کی مسلسل دو سالہ محنت کا، تو پھر ان کے بہتر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے اور اگر اس صورت میں میں نے بھی اصلاحات کی موافقت میں اظہار خیال کیا تو کیا غلطی کی۔

ہاں، اگر وہ اصلاحات کو کم عقلوں اور ناتجربہ کار ہستیوں کی محنت کا نتیجہ بتاتے اور میری موافقت پر اظہار برہمی کرتے تو بیشک ایک بات تھی۔ لیکن تماشہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ خوف یا مصلحت سے ان "تجربہ کار ہستیوں" کی محنت کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہیں اور دوسری طرف اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دبی زبان سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اصلاحات قابل قبول نہیں اور بہانہ یہ ہے کہ اصلاحات سے اقتدار شاہانہ پر خراب اثر پڑتا ہے

دوسری بات انھوں نے یہ لکھی ہے کہ "حضرت کے اشارہ پر غیروں کی نہیں، ہماری زندگیاں صدقہ ہونے کو آمادہ ہیں اور مالک کی غلامی کے طوق کے واسطے نیازکی نہیں ہماری گردنیں زیادہ زیب دیتی ہیں"۔

میں اُن کے اس جذبۂ اتقیاد و اطاعت کی داد دیتا ہوں۔ اپنے مالک کی حمایت میں ان کو یقیناً یہی جذبۂ فدویت و ایثار پیدا کرنا چاہئے، لیکن ترابی صاحب معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اس جذبہ کے اظہار سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے واقعی شہریار دکن کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا ہے

ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ اہل دکن کے وہ ہندوستان کے کسی باشندہ کو اس کا مستحق نہیں جانتے کہ وہ بارگاہ اعلحضرت کے ساتھ اظہار عقیدت کرے، گویا بہ الفاظ دیگر وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اعلحضرت کے فیوض و برکات صرف دکن ہی تک محدود ہیں۔ لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ بیرون دکن کے مسلمانوں نے آج تک اعلحضرت کے لئے، جذبۂ ایثار و قربانی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تو یہ اور زیادہ لغو و مہمل دعوے ہوگا

دکن کے تخت وتاج کے ساتھ جمہور مسلمین کے تعلقات اتنے دیرینہ و مستحکم ہیں کہ ترابی صاحب کا ان سے انکار کرنا، مسلّمہ حقیقت سے روگردانی کرنا ہے۔ سلطنتِ دکن چونکہ مغلیہ حکومت کی دوسری شکل ہے اس لئے انتزاعِ دولتِ مغلیہ سے پہلے ہی شمالی ہند کے اکابر و اعاظم دامنِ آصفجاہی سے وابستہ ہوکر دکن پہونچ گئے تھے اور اُسوقت سے لیکر تا ایندم تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ حیدر آباد، شمالی ہند کے منتخب دماغوں کا مرکز نہ رہا ہو اور شاہانِ دکن نے اپنی خسروانہ روایات سے کام لیکر ان کے فضل وکمال کی قدر نہ کی ہو

شاہانِ دکن نے ہندوستان کی مسلم جماعت کے کبھی دو ٹکڑے نہیں کئے، انھوں نے اِس کُل کے اجزاء کرکے کبھی جماعت اسلامی میں تفریق پیدا نہیں کی، اور مسلم جماعت کا مفہوم انھوں نے دکنی و غیر دکنی نقطۂ نظر سے کبھی متعین نہیں کیا۔ ملازمتوں کے لئے ملکی و غیر ملکی تحریک بالکل دوسری چیز ہے جس کا تعلق صرف مقامی اقتصادیات سے ہے نہ کہ عام اخلاق وسیاست سے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جو وابستگی شاہان دکن سے ہے اس کا تعلق صرف ان کے مسلم فرمانروا ہونے کی حیثیت سے ہے اور شاہانِ دکن کو جو تعلق ہندوستان کے مسلمانوں سے ہے وہ بھی اسی بناء پر ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں بھی ہیں ایک ہیں اور سرزمین کا اختلاف اس رشتۂ اتحاد کو کسی طرح نہیں توڑ سکتا

چنانچہ یہی وہ تعلقات ہیں جن کی بناء پر ہندوستان کے اکثر تعلیمی و روحانی ادارے بلا امتیازِ ملت و مسلک فرمانروایانِ دکن کے رشحاتِ کرم سے سیراب نظر آتے ہیں اور یہی وہ روحانی وابستگی ہے جس کے زیر اثر ہندوستان کے ہر مسلمان کا دل "حیدر آباد" اور "نظام" کا نام سنکر اپنے اندر فخر وغرور کا جذبہ محسوس کرنے لگتا ہے

حیران ہوں کہ تراب صاحب نے کیونکر یہ بے سروپا بات لکھدی کہ "اعلحضرت کے اشارہ پر غیروں کی نہیں ہماری زندگیاں صدقہ ہونے کو آمادہ ہیں" معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کو شمالی ہند کی طرف سفر کرنے کا موقعہ کبھی نہیں ملا، ورنہ وہ دیکھتے کہ حیدر آباد کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو اس جوار کے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز نہ قرار پاجاتا ہو اور تمام مسلم پریس پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس پر اظہار خیال نہ کرتا ہو۔ اور واقعات کو جانے دیجئے صرف حال کی آریہ سماجی تحریک ہی کو لے لیجئے کہ پشاور سے لیکر بنگال کے بعید ترین گوشہ تک اور کشمیر سے لیکر انتہائی نقطۂ جنوب تک کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر نہ دوڑ گئی ہو، اگر تراب صاحب اس زمانہ میں یہاں ہوتے تو دیکھتے کہ مسلمانوں کے جوش کا وہ عالم تھا کہ حکومت کو قیام امن کے لئے مجبوراً یہ احکام نافذ کرنا پڑے کہ جلوس میں کوئی ایک لفظ منھ سے ایسا نہ نکالا جائے جس کا حضور نظام کی ذات سے ادنیٰ سا تعلق ہو یہاں کے مسلمانوں نے عظیم الشان مظاہرے کئے، جوابی جلوس نکالے، بڑے بڑے اجتماعات سے

اس تحریک کی مخالفت کی، انجمنیں قایم کر کے سماجی جتھوں کی قوت کو ضعیف کیا، مسلم اخبارات نے مسلسل مقالات لکھ کر دنیا پر ثابت کر دیا کہ اس تحریک کی حقیقت کیا ہے اور یہ ظاہر کرنا غالباً قرین مصلحت نہ ہوگا کہ نگار ہی کے ایک مقالہ سے متاثر ہو کر صوبۂ سرحد کے ایک مقام میں آریاؤں نے اپنا جلوس نکالنا ملتوی کر دیا

اب اس کے مقابلہ میں اگر تراب صاحب سے میں یہ مطالبہ کروں کہ وہ اپنی قربانیوں کی فہرست پیش کریں تو غالباً بے محل نہ ہوگا، یقیناً وہ اس کے جواب میں جمعیت اتحاد المسلمین کا حوالہ دیں گے، لیکن کیا میں ان سے دریافت کر سکتا ہوں کہ انھوں نے اس باب میں مسٹر جناح سے بہ حیثیت صدر مسلم لیگ ہونے کے مشورہ و استصواب نہیں کیا اور کیا مسلم لیگ شمالی ہند اور خصوصیت کے ساتھ یو۔ پی کے مسلمانوں کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے۔ پھر سوال اس وقت نہ احسان جتانے کا ہے نہ احسان فراموشی پر بازپرس کرنے کا بلکہ صرف اس بات کا کہ کیا تراب صاحب حقیقت پر خاک ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

مجھے اس کا اقرار ہے کہ اہل دکن کو اپنے فرمانروا سے محبت ہے، لیکن ہماری عقیدت سے کیوں انکار کیا جائے؟ بیشک ہم اور وہ دونوں فرمانروائے دکن کو "ظل سبحانی" کہتے ہیں، لیکن تعبیر کی نوعیت اور مفہوم میں بڑا فرق ہے۔ وہ شاہِ دکن سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ اُن کا ان داتا ہے، ہمارے دلوں میں ذاتِ شاہانہ کی عظمت اس لئے ہے کہ وہ ایک مسلم فرمانروا ہے۔ وہ ذاتِ شاہانہ کے اقتدار کا مفہوم صرف یہ قرار دیتے ہیں کہ سوائے ایک مخصوص جماعت کے کسی اور کے لئے اسے بذل و کرم سے کام لینا ہی نہیں چاہئے اور ہمارے نزدیک اس کا اقتدار اس صحیح اسلامی تعلیم میں پنہاں ہے جو ساری دنیا کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دینا چاہتی ہے۔ وہ شاہِ دکن کو صرف مسلمانان دکن ہی کا بادشاہ قرار دیتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی فرمانروائی کا اصل جوہر یہ ہے کہ وہاں کی غیر مسلم جماعتیں بھی ان کو اپنا ماویٰ و ملجا قرار دیتی ہیں۔ وہ سلطنت آصفجاہی کے اثرات کو صرف دکن کی چند لاکھ مسلم آبادی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور ہم اس کے حلقہ میں ہندوستان کی نو کرور مسلم آبادی کو گھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ بیرونِ حیدر آباد کے مسلمانوں سے اظہارِ عقیدت کا حق چھین کر شاہانِ دکن کی اُن روایاتِ بذل و کرم کو محو کر دینا چاہتے ہیں جو دکن سے باہر بھی ہزاروں علمی و اجتماعی اداروں کی زندگی کا سرچشمہ ہیں اور ہم اپنے اظہارِ عقیدت کا حق تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو اس بنا پر کہ شاہِ دکن ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے تنہا نمایندہ ہیں۔ المختصر یہ کہ ان کے جذبۂ اطاعت کی بنیاد صرف "نمکخواری نظام" پر قایم ہوتی ہے اور ہماری عقیدت "پاسداریِ اسلام" پر، اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے

تراب صاحب نے ظاہر کیا ہے کہ "سیاسی نقطۂ نظر" سے میرے مضمون پر تنقید کرنے کا وقت نہیں لیکن اس کا اخلاقی پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یعنی دستوری اصلاحات سے متعلق وہ میرے مقالہ پر کوئی رائے زنی

تو نہیں کرنا چاہتے لیکن اخلاقی حیثیت سے اسے ایک جرم سمجھتے ہیں اور دلیل صرف یہ ہے کہ حیدرآباد سے باہر رہکر وہاں کی سیاسیات پر کچھ لکھنا مضحکہ خیز بات ہے

اول تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس میں اخلاق کا تنبیہی پہلو کیا تھا، انھوں نے تو سر پھیر کر وہی سیاسیات کا ذکر چھیڑ دیا جس پر رائے زنی وہ مناسب نہ سمجھتے تھے۔ دوسرا کلیہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے یعنی جو شخص حیدرآباد کا باشندہ نہ ہو وہ نہ وہاں کی سیاسیات کو سمجھ سکتا ہے نہ وہاں کے مسایل پر اسے رائے زنی کا حق حاصل ہے۔ اگر یہ نظریہ تراب صاحب کا صحیح ہے تو مجھے بُرا ماننے کی ضرورت نہیں کیونکہ پھر تو مجھ سے زیادہ نامعقول ولایت کے اخبارات ہیں جو حیدرآباد سے گیارہ ہزار میل کے فاصلہ پر رہکر وہاں کے معاملات پر گفتگو کرتے ہیں، میں تو صرف گیارہ سو میل دور رہتا ہوں!

معلوم ہوتا ہے صحافت کا معیار تراب صاحب نے اپنی ہی تنگ و محدود معلومات کو سامنے رکھکر قایم کیا ہے اور وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ جدید ذرایع مخابرات نے زمین کی تنابیں کھینچکر فاصلہ کا مفہوم ہی بدلدیا ہے اور حیدرآباد تراب صاحب سے اتنا قریب نہیں ہے جتنا ہم سے ہے

انھوں نے ایک جگہ میرے اس قول کو نقل کیا ہے کہ "ہر ملک کی آب و ہوا کا خاص اثر ہوتا ہے اور ہر قوم کی سیاست کا مخصوص اقتضاء" اور اس قول پر تفریع کرکے وہ اصلاحات پر میری رائے زنی کو غلط ٹھیراتے ہیں۔ یہاں بھی تراب صاحب نے انتہائی تنگ نظری سے کام لیا۔ میں نے ملک کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں حیدرآباد بھی شامل ہے اور قوم کا لفظ لکھا ہے جس میں ہندوستان کے تمام مسلمان داخل ہیں۔ ممکن ہے وہ حیدرآبادی مسلمانوں کو کسی اور قوم میں شمار کرتے ہوں، لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ہم میں اُن میں کوئی فرق نہیں اور حیدرآباد کا کوئی سیاسی یا اجتماعی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو روحانی تعلق حاصل نہ ہو

تراب صاحب نے تعریضاً میرے اس فقرہ کو بھی نقل کیا ہے کہ "اسلام، نازیت و فسطائیت نہیں کہ ذاتی خود غرضی پر ساری دنیا کی قربانی چڑھادے" لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے یہ کہکر کس غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ کیا تراب صاحب کے نزدیک اسلام واقعی نازیت ہے، اور کیا حیدرآباد کی جماعت اتحاد المسلمین میں یہی روح کام کررہی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ شاہ عثمان کے دورِ اسلامی میں نام نہاد اتحاد المسلمین کے صدر کو ہٹلر بننے کی فرصت کبھی نہیں مل سکتی اور تراب صاحب کا خوابِ نازیت کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا

ایک جگہ انھوں نے میرا یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ "اسلام نے اکاسرۂ عجم کی سلطنتیں اس لئے نہیں مٹائی تھیں کہ پھر کسریٰ پیدا ہوں" اور اس فقرہ کا مفہوم شاید وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ میں اعلیحضرت کے شخصی اقتدار کا مخالف ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مضمون نگار اپنی ذہنی بے مایگی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کوئی پیش نہ کرسکتا تھا

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ شخص جس نے حیدر آباد میں پرورش پائی ہو، جس کی رگ رگ میں فرمانروائے دکن کا نمک دوڑ رہا ہو اور جس کو اس قدر قریب سے تمام حالات کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہو، وہی شاہِ عثمان کی خصوصیات سے اتنا بے خبر ہو! یقیناً اس نے ابتک یہی نہیں سمجھا کہ دکن کا موجودہ فرمانروا دکن اکابرِ اسلام کی یادگار ہے اور کونسا آئین سلطنت اس کی حکومت کا مدار ۔۔۔ اقتدار کا مفہوم ذاتِ شاہانہ کے نزدیک وہ ہیبت و خوف نہیں ہے جو چنگیز و ہلاکو نے پیدا کیا تھا، سطوت و جبروت کی تعبیر اعلیحضرت نے کبھی وہ نہیں سمجھی، جو نیرو اور کالیگولا نے سمجھی تھی اور شوکت و مرتبت کی وہ غلط تاویل کبھی ذاتِ شاہانہ نے نہیں کی جو دنیا کے استبداد پسند بادشاہوں کا دستور رہا ہے

اعلیحضرت نے اپنے اخلاق کی تعمیر میں ہمیشہ سیرتِ نبوی کو سامنے رکھا ہے اور آئینِ حکومت میں اس جادۂ مستقیم کو جسے بانیِ اسلام متعین کر چکا ہے، اس لئے میں ان کو یادگارِ فغفور و کسریٰ سمجھنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہمارے لئے فخر و غرور کی بات اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اخلاقِ اسلامی کے زندہ کرنے والے ہیں اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے وہ سب کچھ قربان کر دینے والے جس کا غرض نفسانی سے ذرا سا بھی تعلق ہو سکتا ہے

میری نگاہ میں اس وقت صرف شاہِ عثمان ہی کی وہ ذات ہے جس نے "رعایت الاصلح فی الشرع" کے اسلامی اصول کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور جو زمانہ کی ضرورت، رعایا کی احتیاج، اور فلاحِ عامہ کی خاطر ہمیشہ اپنے قانون اور اپنے آئینِ حکومت میں تبدیلی کے لئے طیار ہو سکتی ہے

ترابؔ صاحب نے یہ بات خوب لکھی کہ "سلطان العلوم کی بارگاہ بے نیاز ہے اور وہاں نیاز کا کام نہیں" اگر سلطان العلوم کی بارگاہ میں نیاز کا کام نہیں تو کیا اس سرتابی و سرکشی کا کام ہے جو حیدر آباد کے بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے اور جس کے ایک حقیر ترین فرد شاید وہ خود بھی ہیں

دوسری عالمگیر جنگ

آج یکم ستمبر تک جو خبریں موصول ہوئی ہیں وہ حد درجہ وحشت انگیز ہیں - جرمنی نہ صرف ڈینزگ لینے پر تلا ہوا ہے بلکہ کاریڈور کا مطالبہ بھی اس نے پیش کر دیا ہے - پولینڈ سمجھتا ہے کہ ڈینزگ کا جرمنی کے قبضہ میں چلا جانا، پولینڈ کے اقتصادی، دفاعی اور سیاسی اقتدار کو خاک میں ملا دے گا - جرمنی کا خیال ہے (اور غالباً بالکل صحیح) کہ ڈینزگ سنہ ۱۴ء سے پہلے اس کے قبضہ میں تھا اور اب پھر اس کے پاس واپس آنا چاہئے

کیونکہ وہاں کی جرمن آبادی، وہاں کا جرمن کلچر دونوں اس کے مقتضی ہیں۔ علاوہ اس کے جب وہ میمل پر قابض ہو چکا ہے، تو ڈینزگ کو چھوڑ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ بحیرۂ بالٹک کے یہی دو بندرگاہ ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے قریب اور براہ راست خط اتصال رکھنے کی وجہ سے ایک ہی زنجیر کی دو کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

برطانیہ اور فرانس ابتک پولینڈ کی امداد پر آمادہ ہیں اور تمام جنگی تدابیر دونوں جگہ عمل میں آرہی ہیں، لیکن روس کے علٰحدہ ہو جانے اور جرمنی کے ساتھ اس کے ساز باز کر لینے کی وجہ سے برطانیہ کا وہ پوزیشن نہیں رہا جو اس سے قبل پایا جاتا تھا

اب سے کئی مہینہ قبل میں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ ہر چند جرمنی اور روس کے درمیان نظریۂ حکومت کے لحاظ سے زمین و آسمان کا بُعد ہے، لیکن پولینڈ کے باب میں اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ دونوں ملکر اس کو آپس میں بانٹ لیں، چنانچہ اس کے آثار پیدا ہو چلے ہیں، کیونکہ باوجود اس کے کہ روس اس جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کر چکا ہے، ساتھ ہی ساتھ غیر معمولی فوجی بھرتی بھی کر رہا ہے، جو جاپان کے مقابلہ کے لئے بتائی جاتی ہے لیکن "روئے سخن" حقیقتاً پولینڈ ہی کی طرف ہے

لندن اور پیرس کی غیر مصافی آبادی ہٹائی جا رہی ہے، بحری راستے فوج کی نگرانی میں دیدئے گئے ہیں، مال کی درآمد برآمد کے لئے حکومت نئے قوانین جاری کر رہی ہے، اسلحہ سازی کے کارخانوں میں رات دن کام ہو رہا ہے، الغرض لڑائی کی مشین کو گردش میں لانے کے لئے صرف برقی بٹن دبانے کی دیر ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ برطانیہ آخر وقت تک قیام امن کی کوشش کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ ہٹلر کو پھر ایک آدھ لقمہ دیکر کچھ دنوں کے لئے اس کا منھ بند کر دیا جائے، لیکن کبتک؟ آج نہیں تو کل جنگ ہونا لازم ہے اور اس لئے ہندوستان کو آخری بار ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر لینا چاہئے کہ بصورت جنگ اس کی پالیسی کیا ہوگی۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور گاندھی جی کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مشورہ کسی طرح حکومت برطانیہ و حکومت ہند کے لئے اندیشہ کا باعث نہیں ہو سکتا۔ سر سکندر حیات خاں نے جو اعلان اس باب میں کیا ہے اگر وہ مسلم لیگ کی زبان نہیں ہے تو کم از کم اُن مسلمانانِ پنجاب کی زبان ضرور ہے، جو ہر راہرو کو رہبر سمجھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے

بہر حال اگر جنگ ہوئی تو اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے لئے یہ عہد آفریں وقت ہوگا، اور اگر اس نے اس نازک وقت میں دانشمندانہ ڈپلومیسی سے کام نہ لیا تو اس کو ہمیشہ کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

مشرقِ ادنیٰ کی سیاسیات پر برطانوی اثر

بظاہر اس وقت مشرقِ ادنیٰ میں دو جنگیں جاری ہیں، ایک برطانیہ اور عربوں کے درمیان، دوسری یہود و عرب کے درمیان، لیکن اندرونی طور پر ایک اور جنگ جاری ہے، اور وہ یہ کہ اس وقت وہاں کئی آدمی ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک عربی ریاستوں کی سیادت کا خواب دیکھ رہا ہے اور جس کا انجام برطانیہ و ہند کے تعلقات پر بڑی حد تک اثر انداز ہونے والا ہے۔ یہ آدمی کون ہیں؟

ا۔ ہز ہائنس امیر عبداللہ فرمانروائے یردن (Trans jordonia) جن کے مسرور چہرہ اور مطمئن انداز سے کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ گزشتہ ۲۰ سال سے وہ سیادت عرب حاصل کرنے کی اُدھیڑ بن میں لگے ہوئے ہیں۔

اپنی نوجوانی میں شریف مکہ کے فرزند ہونے کی حیثیت سے ان کا عسکری مستقبل بہت شاندار تھا، لیکن جب پہلی ہی جنگ میں اپنے باپ کی فوجوں سے ان کو شکست حاصل ہوئی تو ان کا یہ خوشگوار خواب ختم ہو گیا۔ کیونکہ عرب میں ایک شکست خوردہ افسر کی حیثیت بہت ذلیل ہو جاتی ہے۔

جس زمانہ میں کرنل لارنس ریگستان عرب میں بغاوت کے بیج بو رہا تھا اس وقت بھی امیر عبداللہ کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی گو اس کے ساتھیوں نے اس کو اُبھارنے کی بہت کوشش کی۔ اس کے بھائی جنگوں میں مصروف تھے اور یہ غیر محاربانہ شہری زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا، لیکن اسے یہ توقع ہنوز باقی تھی کہ سلطنت ترکی کے ٹکڑے کر کے برطانیہ نے جو متعدد حکومتیں عربستان میں قایم کی ہیں، ان میں سے کسی نہ کسی حکومت کی امارت ضرور اس کے سپرد کی جائے گی۔

جب جنگ عظیم ختم ہوئی تو اس کا باپ (حسین) مکہ و حجاز کا فرمانروا بنایا گیا، اس کا بڑا بھائی جدہ کا اور چھوٹا بھائی (فیصل) شام کا اور بعد کو عراق کا۔ صرف عبداللہ رہ گیا تھا لیکن بڑی بحث و گفتگو کے بعد شرق یردن کی امارت اس کو ملگئی۔

اس کی حکومت کا رقبہ آئرلینڈ کے برابر ہے۔ یہاں تقریباً تین لاکھ عرب آباد ہیں جن میں سے دو تہائی

ابتک بدویانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ عبداللہ انھیں پر حکومت کر رہا ہے اور دمشق و بغداد میں فاتحانہ داخلہ کی تمنا ہنوز اس کے دل میں باقی ہے۔

وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہود و عرب ایک جگہ امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے، وہ اس سے بھی واقف ہے کہ برطانیہ ضرور اس جھگڑے کو ایسے نہج سے طے کرے گی جو اس کے مصالح کے منافی نہ ہو اور اس دوران میں اسکے ساتھیوں اور خصوصیت کے ساتھ اس کے بڑے بیٹے نے کئی بار اسے آمادہ کیا کہ وہ فلسطین پر لشکر کشی کر دے، لیکن اس نے انکار کر دیا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ امن سے بیٹھے رہنے کی قیمت ضرور اسے برطانیہ سے ملیگی، چنانچہ ماہرین کا خیال ہے کہ برطانیہ، فلسطین کا ایک حصہ شرق یردن میں ملا کر اس کے حوالہ کر دے گا تاکہ مشرق ادنی میں ایک اور زبردست دوست و ہمدرد اس کا پیدا ہو جائے۔

۲- حاجی امین الحسینی سے اس وقت ہر وہ شخص واقف ہے جس نے فلسطین کی موجودہ نزاع کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ نہایت ذہین، ہوشیار اور مدبر شخص ہے۔ عرب آبادی پر ان کو بڑا اقتدار حاصل ہے اور اسی اقتدار سے کام لیکر انھوں نے یہود و عرب کے مسئلہ کو برطانیہ کے لئے تشویشناک بنا دیا ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ ان تدابیر سے ان کا مقصود خود اپنی سیادت قایم کرنا ہے۔

جب جنگ کے بعد سر رجنالڈ اسٹورس، فلسطین کا ہائی کمشنر مقرر ہوا، تو اس نے امین الحسینی کو خفیہ پولیس میں انسپکٹری کی جگہ دیدی، لیکن جب بعد کو معلوم ہوا کہ یہ برطانیہ کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں تو علحدہ کر دیا۔ یہ فلسطین چھوڑ کر جامعۂ ازہر چلے گئے اور چونکہ ان کے باپ بھائی فلسطین کے مفتی رہ چکے تھے، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ خود بھی مفتی ہونے کی توقع نہ رکھتے۔ جب وہ جامعۂ ازہر سے واپس آئے تو انقلابی تحریک کے لیڈر ہو گئے اور سر ہربرٹ سمویل (ہائی کمشنر) نے اُن کو قابو میں کرنے کے لئے یروشلم کا مفتی اعظم بنا دیا۔ لیکن چونکہ یہ ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے انھوں نے در پردہ دوسری حکومتوں سے ساز باز شروع کر دی اور یہ اس عہدہ سے برطرف کر کے مسجد عمر میں مقید کر دئے گئے۔ یہاں سے پوشیدہ طور پر نکل کر یہ شام چلے گئے اور وہیں سے وہ برطانیہ کے خلاف پروپاگنڈا کر رہے ہیں۔

امین الحسینی بہت آزاد خیال آدمی ہیں لیکن اگر فلسطین کے مسئلہ کا فیصلہ یوں کر دیا جائے کہ وہ یہاں کے امیر یا حاکم بنا دئے جائیں تو غالباً ان کی یہ تگ و دو ختم ہو جائے، کیونکہ ان کی ذہنیت جذبۂ حکومت سے خالی نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ فرمانروائے فلسطین بننے ہی کے لئے کر رہے ہوں۔

(۳) عربی ریاستوں میں جتنی قوت ابن سعود کو حاصل ہے کسی کو نہیں۔ ان کے پاس ملک بھی وسیع ہے، فوج بھی زیادہ ہے، اسلحہ کی بھی افراط ہے اور محافظ حرمین ہونے کی وجہ سے مسلمانوں پر اقتدار بھی کافی حاصل ہے

اور اسی لئے مشرق ادنیٰ کے مسایل میں ہر فریق یا تو ابن سعود کو اپنا طرفدار بنانا چاہتا ہے یا کم از کم غیر جانبدار۔

ابن سعود اس قدر گہرا انسان ہے کہ اس کے خاص احباب کو بھی علم نہیں کہ اس کے اندر نپولین کی روح کام کر رہی ہے اور وہ پورے جزیرہ نمائے عرب پر قابض ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی تربیت کے لحاظ سے نہایت سخت وہابی قسم کا مسلمان ہے اور اسی طرح کی حکومت وہ کر رہا ہے۔ نہ وہ تماکو کا استعمال کرتا ہے، نہ شراب کا اور صوم و صلوٰۃ کا سخت پابند ہے۔ اپنے قد و قامت اور صورت و شکل کے لحاظ سے بھی بہت شاندار انسان ہے اور سوائے اس ایک نقص کے کہ کسی بیماری کی وجہ سے اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی ہے، وہ بہت صحیح و تندرست شخص ہے۔ وہ طویل گفتگو پسند نہیں کرتا اور بہت جلد فیصلہ کر لینے کا عادی ہے۔

ان کا اصل نام عبدالعزیز ہے اور عمر ۵۸ سال کی ہے۔ یہ اس سعود اعظم کی اولادیں سے ہیں جو اٹھارویں صدی کے اخیر میں تمام عرب پر قابض ہو گئے تھے۔ عبدالعزیز ابھی بہت کمسن تھے، والی ریاض نے ان کو معہ انکے باپ کے کویت جلاوطن کر دیا۔ ان کی عمر بیس سال کی تھی کہ انھوں نے بدؤں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ ریاض پر حملہ کیا اور قلعہ پر قابض ہو گئے۔ اس طرح گویا آدھا نجد ان کے قبضہ میں آگیا اور اسوقت سے لیکر اسوقت تک ان کی عسکری و سیاسی اہمیت برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے، یہاں تک کہ عربستان کی سب سے زیادہ قوی حکومت انھیں کی سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے لوٹ مار کا استیصال کیا، مالی حالت کو درست کیا اور نہایت منظم فوج مرتب کی۔ اسوقت سعودی حکومت بحر احمر سے خلیج فارس تک اور دوسری طرف شام و عراق تک وسیع ہے۔

ابن سعود ۳۰ لاکھ نفوس پر حکمراں ہے اور ریاض ان کا دارالسلطنت ہے جو اینٹوں کی فصیل سے محصور ہے اور درمیان میں ایک بڑا میدان ہے جو بدؤں سے بھرا رہتا ہے۔ یہ لوگ اپنے معاملات میں ابن سعود سے مشورہ و حکم لینے کے لئے آتے ہیں اور تین دن تک انھیں اس میدان میں قیام کرنے کی اجازت ہے۔ ابن سعود کا محل اسی میدان کے ایک جانب واقع ہے جو بہت سادہ ہے۔

جنگ عظیم میں ابن سعود کو غیر جانبدار رہنے کا معاوضہ برطانوی حکومت سے ۶۰ ہزار پونڈ سالانہ ملتا تھا۔ جنگ ختم ہونے پر ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اپنے ملک کو بہت وسیع کر لیا یہاں تک کہ وہ نجد و حجاز کے بادشاہ کہلانے لگے۔ ان میں ایک بڑے فرمانروا ہونے کی تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ۶ فٹ ۴ انچ کا دیو پیکر انسان جس میں جرات و ہمت کے علاوہ سیاست دانی بھی پائی جائے یقیناً ایک بہترین فرمانروا بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں مذہبی غلو بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ ملک کے اندر گراموفون کہیں نہیں پایا جاتا، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ عملی انسان بھی ہیں اور نجد و حجاز کے ریگستانی حصوں کو شاداب و کارآمد

بنانے میں وہ تمام جدید ذرایع سے کام لے رہے ہیں۔ ریاض میں ریڈیو اسٹیشن بھی موجود ہے اور ٹیلی فون بھی۔
ہم ــ برطانوی ہائی کمشنر سے لیکر اُن یمنی لڑکوں تک جو یروشلم کے ڈاک خانہ کے سامنے اخبار بیچا کرتے ہیں، کوئی ایسا نہیں جو فوزی کے نام سے واقف نہ ہو اور شاید ہی کوئی عرب، یہودی یا انگریز ایسا ہو جو فوزی کے کارناموں سے آگاہ نہ ہو۔

شام میں سُولی اس کے لئے طیار ہے، فلسطین کا جلاد اس کی ملاقات کا منتظر ہے، اور سعودی عرب میں تو یہ حال ہے کہ اگر یہاں گرفتار ہو جائے تو ابن سعود خود اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

فوزی کے پاس تین چار ہزار عربوں کی جمعیت ہے اور اس کی مدد سے اس نے فلسطین کے صحراؤں اور پہاڑوں کو ناقابل گزر بنا رکھا ہے۔ اس کے تمام ساتھی پہاڑوں کے رہنے والے نہایت خونخوار ہیں جو سوائے جان لے لینے یا جان دیدینے کے کچھ نہیں جانتے۔ لیکن وہ برطانوی سپاہ سے باقاعدہ جنگ کرنے سے ہمیشہ بچتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی شکست ظاہر ہے۔ وہ صرف اس موقعہ کا منتظر ہے کہ فلسطین میں بدامنی و بغاوت رونما ہو اور وہ اس میں حصہ لیکر کسی حصۂ زمین پر قابض ہو جائے۔ فلسطین میں شبخون مارنے کی ابتدا اسی نے کی۔ یہ چپکے چپکے رات کے وقت اپنے ساتھیوں کو لیکر پہونچ جاتا ہے، اور گاؤں میں آگ لگاکر کھیتیاں تباہ کرکے صبح ہونے سے پہلے ہی واپس آجاتا ہے اور پہاڑوں میں چھپ رہتا ہے۔

یہ اوسط قد، گٹھا ہوا جسم رکھتا ہے اور اپنی شہرت کا بڑا شایق ہے، چنانچہ یروشلم کی خفیہ پولیس کے پاس اس کے متعدد فوٹو مختلف حالتوں کے موجود ہیں۔ کہیں فوج کے ریویو میں مشغول ہے، کہیں اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا ہے اور کسی تصویر میں سو رہا ہے یا کسی اور مشغلہ میں مصروف ہے۔ یہ انگریزی لباس کا بہت شایق ہے، اس کا عہد طفلی، شام میں بسر ہوا تھا اور فوجی تعلیم کے لئے قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا جنگ عظیم کے دوران میں اس نے کیا کیا، اس کا حال نہیں معلوم۔ بعض کا خیال ہے کہ ترکی فوج میں کپتان تھا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کرنل لارنس سے مل گیا تھا، بہرحال جنگ عظیم میں اس نے جو کچھ بھی کیا ہو، لیکن جنگ کے بعد اس نے ایک انقلابی سردار کی حیثیت ضرور اختیار کرلی۔ فرانسیسی حکومت نے اس کو ایک بار گرفتار کرکے سزائے موت کا حکم صادر کر دیا تھا، لیکن قتل ہونے سے چند گھنٹے قبل کسی تدبیر سے یہ بھاگ نکلا۔ اس کے بعد اس نے شاہ فیصل کی ملازمت اختیار کی اور عراقی فوج میں اس کو ایک عہدہ مل گیا، لیکن بعد کو وہ (Pan Arabian) سازش میں شریک ہو گیا اور یہاں سے بھی اسے بھاگنا پڑا۔

چونکہ عربستان میں بہت سے شیوخ و امراء ہیں اور ان میں سے ہر ایک ترکی فوج کے تجربہ کار افسر کو لینا پسند کرتا ہے اس لئے ابن سعود نے اسے اپنی فوج کی تنظیم پر مامور کیا۔ اس نے کئی سال تک

یہاں کام کیا لیکن بعد کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ مخالف قبایل سے بھی ساز باز رکھتا ہے تو یہاں سے بھی بھاگا اور امیر عبداللہ کے پاس پہونچا۔ امیر نے اسے ملازم تو رکھا نہیں لیکن ایک گاؤں میں سر چھپانے کی جگہ دیدی۔

اس کے بعد جب فلسطین میں بے چینی شروع ہوئی تو یہ پھر باہر نکلا اور اس نے ان تمام عربوں کو یکجا کرنا شروع کیا جنھیں برطانوی فوج نے منتشر کر کے جلاوطن کر دیا تھا اور اب انھیں کو وہ باقاعدہ فوجی تعلیم دیکر اپنی سپاہ مرتب کر رہا ہے۔ اس کی نگاہ اب صرف فلسطین پر ہے اور اس میں شک نہیں کہ فلسطین کا مسئلہ اس سے جنگ کئے بغیر ختم نہیں ہو سکتا۔

(۵)۔ برطانوی پالیسی اب نہ فلسطین میں بلکہ ہر جگہ بدل گئی ہے۔ وارن ہیٹنگز اور لارڈ کلایو کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب وہ "حکومت بالواسطہ" (Indirect rule) پر عامل ہے، گویا یوں سمجھئے کہ آہنی دستانے پر نرم چمڑے کا خول چڑھا لیا گیا ہے، چنانچہ جس وقت فلسطین میں بے چینی شروع ہوئی تو برطانیہ نے صرف ہوائی جہاز ٹینک اور مشین گن سے کام نہیں لیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ چند آدمی اس اہلیت کے بھی روانہ کئے جو کرنل لارنس کی سی حرکتیں کر سکیں۔

بظاہر ان لوگوں کا کام بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت بہت مشکل ہے۔ ایک طرف امراء عربستان سے ساز باز کرنا، دوسری طرف وحشی بدوؤں کی ہمدردی حاصل کرنا اور پھر ان سب کے اندرونی رازوں اور تدبیروں پر آگاہی پانا، معمولی بات نہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا عربستان کے مستقبل میں تین آدمیوں کے ہاتھ شامل ہونا ضروری ہے۔ ابن سعود۔ امیر عبداللہ اور فوزی۔ اس لئے تین برطانوی ایجنٹ انھیں تین کے حالات معلوم کرنے کے لئے متعین کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک "فریڈرک جرارڈ پیک" ہے یہ کرنل لارنس کا دست راست رہا ہے اور نہایت ہوش و گوش کا انسان ہے۔

جنگ عظیم کے بعد جب ترکی حکومت کو عربستان سے ختم کیا گیا تو یہ اس کمیٹی کا ممبر تھا جس نے عرب ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کیا تھا۔ کچھ دنوں اس نے امیر فیصل کے پاس کام کیا، پھر ابن سعود کے پاس پہونچا اور قبایل نجد کے شیوخ سے بھی ملتا رہا۔ اس کے بعد یہ امیر عبداللہ کا مشیر خاص بن گیا اور شریف مکہ پر زبردست اقتدار حاصل کر لیا۔ امیر عبداللہ کے یہاں یہ حفاظت عامہ کا ڈائرکٹر تھا اور پیک پاشا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے ۱۹۲۱ء میں کچھ عربی دستے نیم فوجی ایسے طیار کئے جو بظاہر پولیس کی خدمات انجام دیتے، لیکن فی الحقیقت ان کا کام اندرون ملک کے لوگوں کی نبض شناسی تھی۔ چنانچہ اس نے قبایل پر اثر ڈالنے کے لئے صحرا میں متعدد قلعے بھی تعمیر کرائے اور ریڈیو ٹرانسمٹر بھی وہاں نصب کئے۔

دوسرا برطانوی ایجنٹ "میجر جان بیگیٹ گلب" ہے۔ اس کے فرایض خانہ بدوش عربی قبایل سے میل جول بڑھانا ہے۔ اہل عرب اس کو اپنا بڑا دوست سمجھتے ہیں اور ابوالحنق کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ اسکی ٹھوڑی پر زخم کا نشان ہے۔ یہ صحرائی راستوں اور وہاں کے قبایل سے اتنا واقف ہے کہ ہوائی جہاز اسے صحرا میں کسی جگہ چھوڑ دیتا ہے اور وہ قریب ترین عربی قبیلہ تک پہونچکر مہینوں کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔ وہ تمام قبایل کی عربی زبان نہایت مہارت سے بولتا ہے اور ان کے عادات وخصایل سے اتنا واقف ہے کہ اسکو وہیں کا باشندہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ وہاں کے وحشی قبایل کو اس پر بہت اعتماد ہے چنانچہ فلسطین کی بے چینی میں بدؤں کا بالکل علحدہ رہنا اسی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ تیسرا برطانوی ایجنٹ جان فلبی ہے جو ابن سعود کا گہرا دوست ہے۔ اور یہ دوستی اس وقت سے قایم ہے جب ابن سعود ترکوں کے خلاف جنگ کر رہا تھا اور فلبی بغداد میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسلمان بھی ہوگیا۔

یہ کرنل لارنس کی اس تحریک کا مخالف تھا کہ شاہ حسین اور اس کے لڑکوں کی سیادت میں عربی فیڈریشن قایم کیا جائے۔ فلبی کے نزدیک لارنس کی یہ تحریک عرب کے اندرونی حالات اور ابن سعود کی قوت سے بیخبری کی بنا پر تھی اور فلبی کا یہ خیال بالکل صحیح نکلا کیونکہ ترکوں کے ختم ہونے کے بعد ہی ابن سعود نے حسین کو مغلوب کرکے نجد وحجاز میں اپنی حکومت قایم کرلی۔

اس میں شک نہیں کہ ابن سعود کی وفاداری برطانیہ کے ساتھ محض فلبی کی وجہ سے ہے اور جبتک برطانیہ کے پاس پیک پاشا۔ گلب اور فلبی ایسے کام کرنے والے موجود ہیں، اسوقت تک عربستان کی حکومتوں کا فیصلہ کبھی برطانوی مفاد کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں، جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں، قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۹ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲ر فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست واکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری وجولائی ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۴ء) فروری ۵ر۔ (سنہ ۳۵ء) فروری، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۶ء) جنوری ۸ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی، جون وستمبر) ۶ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری ۸ر۔ مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

کیا ناسخ نے واقعی اردو زبان کی اصلاح کی؟

جب دہلی کی طوائف الملوکی نے دہلی کے کاملین فن کو پراگندہ روزی پراگندہ دل کرکے اطراف ہندوستان میں سرگرداں اور آوارہ بنا دیا تو شاعروں کو بھی چین نہ ملا۔ اور کہیں تو اس فن کی قدر بہت ہی دشوار تھی مگر دہلی ہی کے قدرداں جو لکھنؤ میں موجود تھے، انھوں نے اس ڈوبتی ناؤ کو بچایا اور ادیبوں، مصنفوں، شاعروں اور زباں دانوں کو اپنے ذیل عاطفت میں پناہ دی۔ ان خانماں خرابوں کو جو دم لینے اور پاؤں ٹیکنے کا موقع ملا، تو بھولی ہوئی رنگ رلیاں یاد آگئیں، زبان اور شاعری کا چرچا ہونے لگا، پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ اسی گمشدہ خواب عیش کا گہوارہ بن گیا۔ اس سرے سے اُس سرے تک شاعری کا روز افزوں سیلاب موجیں مارتا دکھائی دینے لگا، زبان کی بحثیں، شاعری کے چرچے، شعرخوانی کی مجلسیں غرض کیا کچھ تھا جو نہ تھا۔ وہی لکھنؤ جس میں اُردو شاعری کا نام و نشان بھی نہ تھا، اب مخزن الشعراء بنکر رہ گیا اور یہ رنگ مصحفی کے دور تک قایم رہا۔ جتنے یہاں کے خوشگو تھے سب دہلی کے رنگ شاعری کے متبع اور دہلی کی زبان کے مقلد رہے اور اسی تقلید و اتباع کی برکت نے بہت سے خوشگو پیدا کئے، چنانچہ خالص لکھنوی شاعروں میں نوازش نے قریب قریب میر سوز کے رنگ کو ایسا نبایا کہ اگر اس کا کلام استاد کے کلام میں ملا دیا جائے تو شاید بڑے بڑے نقاد بھی یہ نہ پہچان سکیں گے کہ یہ میر سوز ہیں یا نوازش، اسی طرح زمانہ گزرتا رہا۔

ناسخ پیدا ہوئے اور اُن کی شاعری کا دور آیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ رہنے والے تو یہاں کے نہ تھے مگر بچپن، جوانی، بڑھاپا سب یہیں گزرا۔ خیر اس سے کوئی بحث نہیں کہیں کے بھی ہوں۔ بہر حال خالص لکھنویت کا نہ اتنا کوئی حریص ہوا نہ مدعی جتنے یہ تھے۔ اول اول انھیں بھی زمانہ کی روش پر چلنا پڑا اور اسی میخانۂ فیض کے متمنی رہے، جس کے سب متوالے تھے، یعنی رنگ زبان و طرز شاعری دہلی ہی سے وابستہ رہا۔ اس اجمال کی تفصیل سن لیجئے:۔

آبحیات میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ "شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے، مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا مولانا زغمی فرماتے ہیں:۔ مجھ سے خود شیخ صاحب نے آغاز شاعری کا حال نقل فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے

جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا، انھوں نے اصلاح نہ دی تو میں شکستہ دل ہو کر چلا آیا اور کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں فرشتہ تو نہیں، اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا،، اس کے بعد شیخ صاحب نے بقول خود یہی سلسلہ جاری رکھا، خود کہا اور خود اصلاح دی اور جو کچھ ہوئے وہ ہوئے۔ مگر ذرا اس پر مولانا آزاد کا نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں " ان کی طبیعت اور زبان دونوں سے میل کھانے والی نہ تھیں اور بے دماغی اس پر طرہ، افسوس میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے ہوں گے سننے کے قابل ہوں گے مگر شیخ صاحب نے وہ کسی کو کب سنائے ہوں گے"۔ ذرا دیکھئے باتوں باتوں میں مولانا آزاد کیا کہہ گئے۔ مولانا رغمی نے جو کچھ مولانا آزاد سے فرمایا میں اس کو صحیح جانتا ہوں اور اسی بنا پر مولانا آزاد کا یہ لکھنا بھی غلط نہیں ہے کہ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ یہ دونوں سچے۔ مگر سنئے :-

"نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفل ہا"۔ شیخ صاحب نے حقیقت کو مجاز کی حد میں بھی نہ رہنے دیا صاف اُڑا گئے اور ایک اُستاد کے حقِ خدمت کو بالکل بھلا دیا۔ دل کا حال تو خدا جانے مگر سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ دلی سے یہ کسی طرح اپنی نسبت ثابت کرنا نہ چاہتے تھے۔ اب سنئے واقعہ حضرت (ناسخ) نے بذاتِ خود تو مولانا رغمی سے میر صاحب کا واقعہ فرما دیا مگر مولانا عبدالحی مرحوم نے اپنے تذکرۂ گل رعنا میں صاف لکھ دیا ہے کہ محمد عیسیٰ تنہا سے تنہائی میں مشورہ کرتے تھے۔ اس پر مولانا نے حسرت موہانی کا ایک فقرہ جو اُنھوں نے مصحفی کے دیوانِ ششم سے نقل کر کے اُردوئے معلیٰ میں لکھا تھا۔ سنداً نقل کر دیا ہے۔ جس سے اس قول کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ پیرِ مغانِ سخن یعنی مصحفی کی وہ عبارت یہ ہے " حصہ ایوان ایں خواں بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستاں محمد عیسیٰ تنہاست و بہ فقیر نیز رسوخے از تہِ دل دارد مقسوم گشت،، اس کے صاف صاف یہ معنے ہیں کہ شیخ ناسخ بالواسطہ مصحفی ہی کے جامِ سخن سے سیراب ہوئے۔ خود مصحفی کے نہیں تو ان کے شاگرد کے شاگرد ضرور تھے۔

شیخ ناسخ نے " کس نیاموخت علم تیر از من،، پر ضرور عمل کیا ہوگا ورنہ اس قدر تغیرات کیوں رونما ہوتے۔

(۱) دلّی کی شاعری جو داخلی رنگ میں کی جاتی تھی ان کے یہاں آ کر خارجی رنگ میں رنگ گئی اور اثر و درد کو خیرباد کہہ گئی (۲) دہلی کے قدیم طرزِ سخنگوئی کو جسے شاعرانِ دہلی متروک کر چکے تھے کیوں زندہ کرتے اور ایہام و تناسب کے پھیر میں کیوں پڑ جاتے۔ (۳) دہلی کی زبان میں اصلاحیں کیوں دیتے اور اس سے لکھنؤ کی زبان کو علیحدہ کیوں کر دیتے۔ (۴) محاوراتِ قدیم میں تصرف کر کے اُن کی جگہ اپنے سُنے ہوئے محاوروں کو کیوں استعمال کرتے۔

غرض یہ مسلمہ بات ہے کہ اُنھوں نے دلی کی تمام باتوں سے اعراض کیا اور زبان سے اعراض ہی اگر ہوتا تو خیر انھوں نے اس میں تراش و خراش اور کتر بیونت شروع کر دی۔ " ناسخ نے زبان کی اصلاح کی، ناسخ نے زبان کی اصلاح کی،، کا غل مچا۔ اُسے لیجئے یہ محسنِ زبان قرار پا گئے اور اپنے پندار میں انھوں نے لکھنؤ کی زبان کو ایک

نئی زبان بنا دیا لوگوں میں دھوم مچ گئی کہ شیخ ناسخ نے زبان و شعر کی اصلاح کی۔

یہ دل خوش کن فقرہ اگر لکھنؤ کا لکھنؤ ہی میں رہتا تو کچھ ایسی بات نہ تھی۔ غضب تو یہ ہوا کہ لکھنؤ سے نکل کر دلی پہونچا اور مرزا غالب ایسے نقاد کو بھی دھوکہ ہو گیا چنانچہ میر مہدی کو لکھتے ہیں:۔

او میاں سید زادے۔ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش، نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی، ہائے دلی، وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی"۔ اسی طرح ایک دوسرے رقعہ میں میر مہدی کو چشم نمائی کی ہے اور دلی کے مقابلہ پر لکھنؤ کی زبان کو بہتر بتایا ہے خط کی ابتداء اس فقرے سے کی ہے "میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی" جس کو پڑھکر میر مہدی نے ذرا تیکھے پن سے جواب دیا ہے اور لکھا ہے " قبلہ و کعبہ آداب بجالاتا ہوں۔ بھلا حضرت مجھے کیوں شرم آئے۔ اگر شرم آئے تو رجب علی بیگ سرور کو آئے، جس نے وہ لاف و گزاف کیا کہ جیسا لکھنؤ ہے ویسا کوئی شہر نہیں۔ اُن سے کہا چاہئے کہ ارے مرد خدا، خدا سے ڈر، لکھنؤ کسی بادشاہ کا دارالخلافہ رہا ہے کونسی تاریخ میں وہاں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے، ماہیت تو اُس کی یہی ہے کہ مضافات صوبۂ اودھ کا ایک شہر ہے یہ دلی کا مقابلہ کیونکر کرے گا۔ اگر پانچسو برس کی تصنیفات دیکھو گے اُس میں بھی یہی لکھا پاؤ گے ؎

حضرت دہلی کنف عدل و داد — جنت عدن است کہ آباد باد

اسی طرح آخر خط تک دلی کی زبان اور طرزِ معاشرت کو سراہا گیا ہے۔ غالب کے اس قسم کے خطوط سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ زبان دہلی کے قایل نہ تھے۔ مگر اصل یہ ہے کہ مرزا اکبرآبادی الاصل تھے اور دلی کی زبان سے نہیں بلکہ دلی والوں سے اس لئے کبیدہ خاطر تھے کہ دلی والوں نے کبھی اُن کی زبان اور ان کی اُردو شاعری کو نہیں مانا، جس کی شہادتیں اُن کے کلام سے بھی ملتی ہیں اور تذکروں سے بھی۔ یہ سب بھڑاس تھی اس بات کی کہ دلی والے ان کو غیر ملکی سمجھ کر زبان میں اپنا ہم پلہ نہ جانتے تھے اور اکثر کہہ گزرتے تھے کہ

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور غالب جواب میں یہ کہتے ہیں:۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اُسے سخنوران کامل،
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

یہ سب شہادتیں ہیں جو صاف صاف بتاتی ہیں کہ دہلی والے اُن کو زبان و بیان دونوں میں مستند نہ جانتے تھے۔ اور اسی باعث سے مرزا کو وہ کچھ کہنا پڑتا تھا جو نہ کہنا چاہئے تھا۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اُن لوگوں کو جو زبان لکھنؤ کے طرفدار تھے اُن کو ایک موقع مل گیا اور اس بنیاد پر عمارتیں بنالی گئیں۔ چنانچہ صفیر بلگرامی جو ناسخ کے بھی شاگرد تھے اور مرزا غالب سے بھی آخر میں استفادہ فرماتے تھے انھوں نے ایک عجیب واقعہ پیش کردیا۔ فرماتے ہیں کہ میں دہلی میں مرزا سے ملنے گیا تو مرزا نے مجھ سے یہ فرمایا کہ "میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کردکھایا تو لکھنؤ نے، اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا۔ اب جس کا جی چاہے تراش خراش رفو کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے، ہاں قواعد لکھ نہیں گیا، قواعد جاننے والا اُس کے کلام کے مزے پاتا ہے۔ ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رکھا، مگر یاد رہے دلی کی برابر میں اس مضمون میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ اس زبان پر اس کے سوا ہوتا کیا۔ میں نے بھی اک طرز خاص ایجاد کیا تھا۔ جس میں ہر مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا۔ مگر یاروں نے اُس کو چلنے نہ دیا"۔ صفیر مرحوم کی اگر یہ گواہی سچی ہے تو اس میں بھی مرزا کی دلی چوٹ زباں تک آپہونچی ہے۔ بہرحال اگر صفیر مرزا کے اس قول ہی پر اس قصہ کو ختم کرتے تو بھی غنیمت تھا۔ مگر انھوں نے ایک اور بھی عمارت بنائی ہے کہ اپنے تذکرہ میں بڑے شد و مد سے اصلاحات ناسخ کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ اصل تذکرہ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے اس لئے میں شعرالہند مولانا عبدالسلام ندوی سے اُس کے ملخص پر کچھ گفتگو کروں گا۔ بہرحال صفیر بلگرامی کی اس سعی و کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے بعد کے تذکرہ نویسوں اور نقادوں کو بھی ایک مشغلہ مل گیا۔ چنانچہ مولانا عبدالسلام نے اپنی کتاب شعرالہند میں ناسخ کی اصلاحات کا ایک باب قایم کردیا ہے۔ اسی طرح دوسرے تاریخ نویسوں کو بھی کافی شبہات ناسخ کی اصلاح کے متعلق ہیں۔ جن کو صاف کرنا ضروری ہے۔ اب ناسخ کے احسانات اور ان کی حقیقت ملاحظہ ہو:۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے زبان اُردو کو ریختہ کہتے تھے لیکن ناسخ کے وقت سے اس کا نام اُردو رکھا گیا اور دلی میں غدر کے زمانے تک، یہ لفظ باقی رہا، جیسا مرزا غالب لکھتے ہیں:۔

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

یہ واقعہ بالکل غلط ہے۔ میرے خیال میں مصحفی کے یہاں پہلے اس معنی میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے چنانچہ تذکرہ ہندی میں حضور کے حال میں لکھتے ہیں "در شاہجہاں آباد بخانہ لطف علیخاں ناطق مشاعرہ بود، غزل طرحی میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف او بمعنی طرف تقرر داشت وازیں جہت بعضے از فصحا اور خلاف اُردو شمردہ بیرویش نکردند" اسی طرح نثار کے حال میں درج کیا ہے "اوائے زبان اُردو چنانکہ

باید از زبان ندرت بیانش سے شود" اسی طرح مہجور کے حال میں لکھا ہے کہ " سہ کتاب در زبان اردوے ریختہ شکرآمیختہ از خامہ فکرش رونق سواد پذیرفتہ" میرزا غالب کا شعر جو پیش کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ چونکہ وہ میر کا ذکر کر رہے ہیں اس لئے اُن کو اس جگہ بجائے اُردو کے ریختہ ہی کہنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ میر کے زمانہ میں اس کو ریختہ ہی کہتے تھے۔ ورنہ غالب کے یہاں کئی رقعات میں اُردو کا لفظ موجود ہے۔ جہاں انھوں نے اُردو کو بہ تذکیر استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں فارسی کے اس شعر میں بھی اُردو کا لفظ موجود ہے ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ بگزر از مجموعہ اُردو کہ بیرنگ من است

اگر اہل دہلی اسوقت تک ریختہ بھی بولتے تھے تو خود ناسخ بھی اس سے مبرا نہ تھے چنانچہ اُن کا یہ شعر اس کا گواہ ہے ؎

سب زمینیں ہیں نئی بتیں ہیں اے یار نئی روز یاں ریختہ کی اُٹھتی ہے دیوار نئی

ناسخ نے بھی یہاں ریختہ بضرورت صنعت استعمال کیا ہے۔

ناسخ کا دوسرا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ پہلے غزل کو بھی ریختہ کہتے تھے، ناسخ نے غزل کا لفظ رائج کیا اور اس لفظ کو متروک قرار دیا۔

لیکن مجھے یقین نہیں کہ کبھی کبھی غزل کو بھی ریختہ کہہ جاتے تھے اور یہ شک اسوقت اور بھی پختہ ہو جاتا ہے جب میں میر حسن مرحوم کا یہ شعر دیکھتا ہوں البعد میں انھوں نے اصناف سخن میں سے ایک ایک کے نام علحدہ علحدہ گنائے ہیں ؎ گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

اس کے علاوہ ناسخ سے بہت پہلے قائم کہہ چکا ہے کہ:-

قائم یہ فیض حضرت سودا ہے ورنہ میں طرحی غزل سے میر کی آتا تھا بر کہیں،

اس لئے یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ناسخ نے اس کی ابتدا کی۔

تیسرا احسان یہ ہے کہ ناسخ نے غزل کی زمینوں میں تصرف کیا اور ردیف کی بنا حروف روابط، یعنی، کا، کے، کو، سے، نے ہتک اور حروف اثبات ونفی یعنی (ہے) اور (نہیں) پر رکھی۔

اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ناسخ کو وہ لمبی لمبی ردیفیں جو پہلے کہی جاتی تھیں پسند نہ آئیں یا یہ کہ ان سے عہدہ برآنہ ہو سکے اسواسطے اُس قسم کی ردیفیں نہ رکھیں، رہیں حروف روابط کی ردیفیں سو یہ برابر قدما کے یہاں پائی جاتی تھیں۔ تاباں کی زمینیں دیکھئے:-

آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا جس کو دیکھا سو اپنے مطلب کا

اے عندلیب باغ سے کچھ کام ہی نہیں چھوٹی ٹبث تو گل کا یہ ہنگام ہی نہیں

اے شمع رو مرے گا جو کوئی تری لگن میں وہ حشر تک رہے گا جلتا ہوا کفن میں،

کب پہونچتا ہے سنبل اس زلف پر شکن کو — جس پر نثار کرئے سو نافۂ ختن کو

گلے لگ رات کو وہ گلبدن جب ساتھ سوتا ہے — ہمارا صبح کا جامہ بسا پھولوں میں ہوتا ہے

دعوے کیا جاتا ہے کہ ناسخ نے افعال میں یہ اہتمام کیا کہ جو افعال اُصولاً صحیح تھے انھیں پر ردیف و قافیہ کی بنیاد رکھی -- اس کا جواب یہ ہے کہ اگر احیاناً قدیم شعراء کے یہاں کچھ افعال ایسے پائے جاتے تھے تو اسکی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا وہ الفاظ اسوقت صحیح اور مجوزالاستعمال تھے یا نہ تھے، اگر تھے تو ناسخ نے اُن کو چھوڑ کر زبان کو محدود کیا۔ مثلاً کہلانا بمعنی کاہلی کرنا جس میں مجبور کا یہ شعر ہے

باتیں دیکھ زمانے کی جی بات میں بھی کہلاتا ہے — خاطر سے سب یاروں کی مجبور غزل کہلاتا ہے

گہنانا بمعنی چاند کا گہن میں آنا، یا برمانا، برمے سے سوراخ کرنا اور اسی قسم کے ترکیبی اور وضعی مصنوعی مصدر ان میں یا سب کو چھوڑنا تھا، یا بالکل نہ چھوڑنا چاہئے تھا۔ ناسخ کے یہاں اس قسم کے افعال موجود ہیں، تو یہ اُن کی متروکات خاص ہیں اور اس قسم کے متروکات اختیاری قریب قریب ہر شاعر کے یہاں ہیں ناسخ اس میں مخصوص نہیں ہیں۔ مگر یہ چیز ہر فصیح نے صرف اپنے لئے مخصوص رکھی ہے دوسروں پر اس کو روا نہیں رکھا، لہٰذا اس کو صفائی زبان کہنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ رہی دوسری شق اگر وہ مصادر غلط تھے تو اسوقت بھی غلط تھے اور اب بھی غلط ہیں اُن کو سند میں نہ لانا چاہئے۔ آپ دیکھیں گے تو ناسخ کے یہاں بھی آپ کو ایسی غلطیاں ملیں گی۔

جائے ہے، آئے ہے وغیرہ افعال میں اہل دہلی کی غزلیں موجود ہیں۔ مگر متاخرین مثلاً غالب، ذوق، مومن کے یہاں اسی قسم کی ردیفیں دیکھ کر یہ سمجھنا کہ وہ اس کو صحیح اور فصیح اور جایز جانتے تھے ایک خطرناک غلطی ہے، اسواسطے کہ انھیں افعال میں صحت کے ساتھ بھی اُن کے یہاں غزلیں موجود ہیں مثال کے طور پر غالب کی اس غزل کو لیجئے:-

دیکھئے قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

جائے ہے اور آئے ہے کی بجائے جاتا ہے اور آتا ہے جب اُن کی سب غزلوں میں ہے تو ہم ان ایک یا دو غزلوں کو سوائے تفنن طبع کے اور کوئی درجہ نہ دیں گے، جیسا کہ آج بھی ہمارے معاصر اس قسم کی زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ غالب کے یہاں آتا ہے، جاتا ہے ملاحظہ ہو:-

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

اسی کے قیاس پر پوری غزل دیکھکر اور اس دعوے سے باز آنا پڑتا ہے کہ یہ اُن کی عدم واقفیت یا کثرت استعمال کا سبب تھا۔ ورنہ صحیح ہزاروں اور غلط غزلوں کے ایک دو ہونے کے کچھ معنے نہیں ہیں۔

پانچواں احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ ناسخ نے اس بدزبانی اور فحاشی کو مٹایا جو قدما سے مخصوص تھی -- اس قسم

کے الفاظ سے زبان کو پاک کرکے اس کو مہذب اور شایستہ بنا دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ کا نکالنا زبان کو تنگ کرنا ہے۔ ہاں اگر غزل سے اس قسم کے خیالات کو نکال دیا تو بیشک یہ ان کی پاکیزگی خیال کی دلیل ہے۔ زبان پر اس احسان کا بار نہیں پڑتا۔ اس پر بھی اگر خود ان کے یہاں اور اُن کے معاصرین کے یہاں ڈھونڈے جائیں تو کچھ نہ کچھ شعر مل ہی رہیں گے مثلاً آتش ؎

اکیلا پا کے نہیں چھوڑنے کا میں تم کو

؎ زال دنیا تنگ کرتی ہے نہایت ہی مجھے ہے مگر اس بیسوا کا کیا بدن فولاد کا ۔ وغیرہ وغیر

اصل یہ ہے کہ فحاشی کے لئے صرف ویسے الفاظ ہی کی ضرورت نہیں بلکہ بڑے پاکیزہ الفاظ میں بھی خراب جذبات کو ادا کیا جا سکتا ہے اور اس میں شاید ناسخ بھی ولی نہ ثابت ہو سکیں۔ مولف شعرالہند نے بتایا ہے کہ جلوۂ خضر میں اس قسم کی تمام اصلاحات کی تفصیل ہے، افسوس کہ وہ میرے پیش نظر نہیں، اگر اس قسم کے الفاظ ہی زبان سے نکل جائیں تو زبان کا فایدہ نہیں بلکہ نقصان ہوگا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناسخ نے جہاں تک ممکن ہوا فارسی، عربی زبان کے الفاظ استعمال کئے اور بھاکا کے الفاظ کو چھوڑ دیا۔

معلوم نہیں کہ یہ فعل مستحق تھا یا نہیں بہر حال شاہ حاتم نے بھی یہی کیا تھا۔ جیسا کہ وہ خود اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کی قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند، و روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ دارند منظور داردہ زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود۔ مختصر کہ لفظے غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود" شاہ حاتم نے جو جو شرایط الفاظ کے بدلنے کی لگائی ہیں کہ قریب الفہم، کثیر الاستعمال، عام فہم، خاص پسند، روزمرہ میرزایاں ہند و فصیحاں رند، و محاورات، ان قیود کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے اُردو کو اُردو بنایا اور محض ہندی بھاکا کے الفاظ نکال کر ان کی جگہ عربی فارسی ٹھونس ٹھانس ہرگز قابل تحسین نہیں جن کا منظر ناسخ کے اس قسم کے شعروں میں نظر آتا ہے

دیکھنا ناسخ سر شیخ معمم کی طرف کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر

بہرحال یہ نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ ناسخ کے لئے قابل فخر۔ اسی وجہ سے نقادوں نے ناسخ کے یہاں سے سیکڑوں شعر اس قسم کے نکالے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عربی فارسی اور ہندی کے جو الفاظ مستعمل تھے اُن کی تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ مقرر نہ تھا، لیکن ناسخ نے اُن الفاظ کی تذکیر و تانیث کے قاعدے بھی بنائے۔

مگر میری نگاہ سے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جو قواعد کے بارے میں ناسخ نے لکھی ہو اور ابھی میرزا غالب

کا بیان آپ نے پڑھا تھا کہ قواعد مرتب نہیں کئے اب رہا تذکیر و تانیث الفاظ کا معاملہ یہ نظری دھوکا اکثر نقادوں کو ہوا ہے کہ تذکیر و تانیث کے قواعد مرتب نہ تھے۔ مگر یہ غلطی ہے۔ دکنی اور ولی کے معاصرین میر اور میر کے معاصرین کے دیوانوں کو ملایئے۔ شاذ و نادر کہیں تذکیر و تانیث میں فرق نظر آئے گا ورنہ وہی ایک سی صورت ہے۔ اگر قواعد مرتب نہ تھے تو یہ یکسانی کہاں سے آگئی۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اس قسم کی کتاب بقید تحریر اُسوقت تک نہ پائی جاتی ہو۔ مگر ڈاکٹر گلکرسٹ کے قواعد کے رسالے میں بھی تذکیر و تانیث کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت میں بھی اچھی خاصی تشریح موجود ہے۔ پھر یہ ادعا کہاں تک صحیح ہوگا کہ تذکیر و تانیث کے علمبردار اول ناسخ مرحوم ہیں۔

ناسخ کا ایک احسان یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بندش کی طرز فارسی کے طرز پر قایم کی جس سے مضامین میں وسعت پیدا ہوگئی اور شعر کے ظاہری حسن میں بھی اضافہ ہوگیا۔

میرے نزدیک اُردو کی بنیاد ہی فارسی طرز پر رکھی گئی ہے اور میر و سودا حتےٰ کہ ولی اور سراج دکھنی سب اسی طرح سے کہتے آئے ہیں اور اس سے ناسخ کا کونسا احسان اُردو کے سر تھوپنا مقصود ہے۔ قایم نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا ہے ؎

قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ۔۔۔ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مضامین عاشقانہ کو کم کر کے ناسخ نے ہر قسم کے مضامین کو شامل غزل کیا جس سے غزل گوئی کے دائرے میں نہایت وسعت پیدا ہوگئی۔

درانحالیکہ یہ خدمت درد، میر و سودا نے انجام دی تھی، ناسخ نے چوٹی، شانہ اور انگیا وغیرہ کے مضامین یا زیوروں کی فہرست ضرور غزل میں شامل کردی۔

کہا جاتا ہے کہ اُردو زبان کی اصلاح کا دور اگرچہ شاہ حاتم ہی کے زمانے سے شروع ہوگیا تھا اور اس کے بعد ہر زمانے میں تبدیلیاں ہوتی رہیں تاہم ناسخ نے اس ضرورت کو بڑی جامعیت کے ساتھ پورا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ کے اکثر پسند کردہ الفاظ پہلے بھی مستعمل تھے۔ جیسے کبھو، کی بجائے کبھی، کسو کی بجائے کسی، بغل بیچ، کے بجائے بغل میں، لاگا کی بجائے لگا، دوانہ کی بجائے دیوانہ وغیرہ وغیرہ۔

اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ گو ناسخ نے متروکات کا کام شد و مد سے کیا۔ مگر وہ کلیتاً خود بھی اس سے بری نہیں ہوسکے چنانچہ ذیل کے اشعار اسکے گواہ ہیں میں اس خیال سے کہ غلطی کتابت یہاں متروکات کو محمول نہ کیا جائے بعض جگہ دو دو شعر سند اً پیش کرونگا اتنے لے۔ بجائے اتنے کیلئے ؎

نقد جاں لائی ہے تارے مول نور اس ماہ سے ۔۔۔ مشتری رکھا ہے نام اتنے لئے برجیس کا
تیر بھی مجھ پر نہیں وہ پھینکتا اتنے لئے ۔۔۔ جانتا ہے بوسہ لے لوں گا لب سوفار کا

زور - بجائے بہت -	عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پیتا ہے شراب	اب تو ناسخ زور رند لاابالی ہو گیا
"	میکشی مجھ سے چھڑاتا ہے بہ زور	ساقیا زاہد بھی کوئی زور ہے
نقارا - بجائے نقارہ مشدد -	کیا ہی حاسد ہو فلک جس نے کہ نوبت پائی	دم میں مانند حباب اس نے نقارا توڑا
" "	ہیضہ دشمن کو کوس رحلت ہو	جلد ہو پھول کر نقارا پیٹ
مولد - بجائے مولود یا میلاد -	آج مولد ہے جناب احمد مختار کا	خار زار دہر میں عالم ہوا گلزار کا
" " "	ہے محب یہ شاہ دل سے حیدر کرار کا	ہو مبارک اس کو مولد احمد مختار کا
اضافت ہندی لفظ پر -	فیروزہ جو ہے نام مبارک تو بجا ہے	لاریب نگ مہر سلیماں ہے یہ گھوڑا
آواز کرنا - بجائے آواز دینا -	سنسان ہے کیا ہجر میں کاشانۂ ناسخ	بولا نہ کوئی میں نے کئی بار کی آواز
"	صبحدم جب صحن مسجد میں اذاں ہونے لگی	ہم نے بھی میخانہ کے دروازے پر آواز کی
"	فوج غم بھاگ چلی شیشۂ مے لا ساقی	لشکر ابر نے کی طبل ظفر کی آواز
دولت - بجائے بدولت -	ترے ہونٹوں کی دولت مثل شربت	ہوا ہے بادۂ گلفام شیریں
انگریز با اعلان نون -	دل ملک انگریز میں جینے سے تنگ ہے	رہنا بدن میں روح کو قید فرنگ ہے
فک اضافت	ہے جواب ناسخ وظیفہ خلق کا	یہ غزل کیا ہے قصیدہ بردہ ہے
تعیں - بجائے متعین -	پاسبان حسن ہے خال اس رخ پرنور پر	کرتے ہیں فلفل حفاظت کو تعیں کافور پر
آشیاں باندھنا - بجائے بنانا -	جا رہا ہے کوئے جاناں میں رقیب رو سیاہ	زاغ نے باندھا ہے اپنا آشیاں گلزار میں
غش لانا - بجائے غش ہونا -	محفل سے اٹھانے کا جب قصد کیا اس نے	دانستہ میں غش لایا تزویر اسے کہتے ہیں
ردیف کو - بجائے کی -	وفور بادہ خواری تک یہاں بنیاد مستی ہو	مرمت ہوتی ہے سیلاب سے کاشانۂ تن کو
اکتفا - بجائے کافی -	ایک تمغا ہے جوانمردی ہے ناسخ ترک حرص	عمر بھر میں ہے دم آب اکتفا تلوار کو
نسیم خلد سی - بجائے خلد کی سی -	بنجائیں عطرداں نہ کیوں گوش سامعیں	خوشبو نسیم خلد سی تیرے سخن میں ہے
آپی - بجائے آپ ہی -	اٹھ گئی جب سے دوئی ناسخ کو کہتا ہے یہی،	آپ ہی شاہد ہے آپی رند شاہد باز ہے
دوسرا مصرع	نام خدا لیا جو نکیرین کے عوض	مر کر بھی اے صنم مجھے اخفائے راز ہے
زنجیر کرنا - بجائے زنجیر لگانا -	اے وعدہ خلاف ایسی ہی منتظری تیری	دروازے کو میں ہر شب زنجیر نہیں کرتا
مع کارواں	عالم کو تیرے چاہ زنخداں سے عشق ہے	یوسف بھی اس کنوئیں میں مع کارواں گرا

شیخ ناسخ نے جو متروکات کئے تھے ان کا کوئی پابند نہیں ہوا تھا بلکہ جیسے اہل دہلی میں خال خال قدیم الفاظ نظم ہوتے تھے اسی طرح لکھنؤ میں۔ اگرچہ یہ سلسلہ مجھے شاہ اختر کے کلام تک نظر آتا ہے مگر کم از کم انکے حریف آتش

کے دو چار شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

میں - بجائے میں نے - بیاباں کو بھی ہنگامِ جنوں میں سیر کر دیکھا
سرِ شوریدہ کو پائے غزالاں پر بھی دھر دیکھا

زور - بجائے عجب بہت - زورِ مردانہ اکھاڑا ہے اکھاڑا عشق کا
چار دن کشتی لڑا جو اس میں وہ رستم ہوا

بھاریاں - بجائے بھاری - عہدِ طفلی میں بھی تھا میں بسکہ سودائی مزاج
بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں

عزیزاں - اُس کی رسوائی بھلا مدِ نظر کیونکر کریں
میرے ماتم میں عزیزاں چشمِ تر کیونکر کریں

مہندی بندھنا - عاجز نہ ہو تصورِ حسن و جمال میں
مہندی بندھی نہیں ترے پائے خیال میں

اسی طرح ان کے تمام معاصرین کے یہاں اس قسم کے اشعار موجود ہیں۔

اب ذرا دیکھیے کہ ناسخ کی بعض اصلاحات کا کیا اثر ہوا۔ دہلی میں فعل کو اسم کا تابع مانکر فعل کو بھی اسم کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ مثلاً روٹی - اسم مونث ہے۔ جب کھانے کا مصدر اسکے ساتھ استعمال کریں گے تو یوں بولیں گے مجھے روٹی کھانی ہے لیکن ناسخ مرحوم نے اس کلیہ کو توڑا اور یہ سوچا کہ مصدر کو ہمیشہ یکساں حالت میں رہنا چاہئے خواہ اسم مونث ہو۔ انھوں نے دہلی کی تقلید سے آزاد ہو کر کہنا شروع کیا۔ مجھے روٹی کھانا ہے، مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے وغیرہ وغیرہ قاعدہ تو جاری ہو گیا۔ مگر اس سے ایک زبردست خرابی یہ پیدا ہو گئی کہ مستورات بھی تذکیر کے صیغے استعمال کرنے لگیں اور واحد کے بجائے جمع بولی جانے لگی۔ مثلاً ایک عورت کہتی ہے کہ ہم آئے تھے۔ اُس کی بجائے میں آئی تھی۔ لکھنؤ میں بہت کم بولا جاتا ہے۔ دہلی میں صرف جمع کی صورت میں ہم آئیں تھیں بولتے ہیں۔

اُنھوں نے اُن تمام الفاظ کو جس سے نسائیت پر کوئی ضرب لگتی تھی قریب قریب متروک کر دیا اور اُن الفاظ کی بجائے غیر فصیح اور پوربی الفاظ کو جگہ دے کر زبان کو غیر فصیح بنا دیا۔

دلّی سے آئے والے الفاظ کو چھوڑ کر یا بھولکر اُن جگہ پوربی یا نہ معلوم کہاں کے الفاظ رکھدئے۔ مثال کے طور پر چند الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

لکھنؤ	دلّی	لکھنؤ	دلی
کنکوا	پتنگ - گڈی	سیند	پہتوا
قیف	پھول	چڈا	چیڑا
چھڑیا	دریائی	کھٹیا	ریوڑی
لوکی	دراز گھیا - گھیا	گرج	گلو
بتوڑی	رسولی	پیٹا	پٹھا
کنکھنے	نقشے	ڈبیتی	چکلا

لکھنؤ	دلّی
ہنسیا	درانتی
کچالو	چاٹ
کندرو	کندوری
گڑھنا	گھڑنا
بھل	بل
چھچھوندر	چھچھوندر
گوہانجنی	انجنہاری

لکھنؤ	دلّی
سجھتیا	سوجھتا
گھلنا	پگھلنا
چٹکی	بُرکی
کڑواہٹ	تیزی مرچ کی
کیل	لونگ
بکھرانا	بکھیرنا

اسی طرح ہزارہا الفاظ بدل کر نہ معلوم کیا سے کیا ہوگئے - اہلِ لکھنؤ عام طور سے کہتے ہیں کہ اب مرکز زبان لکھنؤ ہے اور اس کی دو وجہیں بیان کی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ ناسخ نے زباں میں تراش و خراش کرکے اس کو صاف کردیا۔ اُس کی حقیقت تو ظاہر ہوچکی - دوسری وجہ یہ ہے کہ دلی میں کچھ باقی نہ تھا بلکہ وہاں کے تمام اہلِ زبان یہاں آگئے تھے، لیکن یہ وجہ بھی درست نہیں - میر، سودا، جرأت، انشاء، مصحفی، میر سوز وغیرہ یقیناً دلی سے یہاں آگئے تھے مگر پھر بھی بہت سے شعراء ایسے ملیں گے جو وہیں رہے اور کسی طرح اُنھوں نے دہلی کا چھوڑنا گوارا نہیں کیا - پھر ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ صرف شعراء ہی تمام زبان کے ذمہ دار یا محافظ نہیں ہوتے - ہزاروں اہل فن ایسے تھے جو وہیں رہے اور اُن میں کا کوئی فرد یہاں نہیں آیا - لکھنؤ کی زبان جب تک دہلی کے نقش قدم پر چلی ترقی کرتی رہی - مگر جب وہ ناسخ کے اختراع و تصنع کے جال میں آئی اُس کی ترقی بند ہوگئی -

مفتش

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

تاریخ اسلامی ہند جو نگار میں جزاً جزاً جنوری تا دسمبر ۳۸ء شایع ہوچکی ہے اُس کے کچھ فارم زاید چھپوالئے گئے تھے - چنانچہ اب وہ کتابی شکل میں طیار ہے وہ اصحاب جو نگار کے خریدار ہیں، لیکن فایل کے علاوہ تاریخ علٰحدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، و نیز وہ اصحاب جو نگار کے خریدار نہیں ہیں اسے حاصل کرسکتے ہیں - کتاب مع توقیت ۲۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت مع محصول ۱۲؍ ہے -

منیجر نگار لکھنؤ

اشتمالیت جمہوریت کی روشنی میں

پرستارانِ اشتمالیت مصر ہیں کہ تا وقتیکہ نظامِ معاشرت سے بلند و پست، ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق نہ مٹا دی جائے جمہوری نظام قطعی ناممکن ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "ریاست کے اندر متضاد طبقوں کے وجود کے یہ معنے ہوں گے کہ ان میں سے ایک ہی طبقہ برسرِ اقتدار ہوگا اور دوسرے کے لئے ضروری ہو جائے گا کہ وہ محکوم رہے اور اس طرح جمہوریت کا یہ دعوے کہ وہ عوام کے ذریعہ سے، عوام کے لئے، عوام کی حکومت ہے بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں تا وقتیکہ جمہوری حکومت کے ساتھ معاشرت کا نظام بھی اشتمالی نہ ہو حقیقی معنوں میں جمہوریت ناممکن ہے"۔ ظاہر معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ جمہوریت میں اکثریت ہی برسرِ اقتدار رہا کرتی ہے اور اقلیتیں سوا، خاموش بیٹھے رہنے یا لایعنی باتیں بنانے کے اور کچھ نہیں کر سکتیں۔

برخلاف اس کے اشتمالیت کا نصب العین اکثریت اور اقلیت کے سوال کو بالکل فنا کر دیتا ہے۔ کیونکہ ریاست سے حاکم و محکوم کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ پوری ریاست میں فقط ایک ہی جماعت رہ جاتی ہے اور کل افرادِ ریاست کا مطمحِ نظر ایک ہی ہو جاتا ہے۔

لیکن فطرتِ انسانی پر نظر رکھتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ طبایعِ انسانی میں اتنی یکجہتی پیدا ہو جائے قرینِ عقل نہیں معلوم ہوتا اور جمہوریت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ جمہوریت و اشتمالیت ایک دوسرے کی معاون ہی نہیں بلکہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناممکن ہے صداقت سے عاری نظر آتا ہے۔

اس لئے مناسب ہے کہ پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ جمہوریت کے کیا معنی ہیں اور آیا جمہوریت و اشتمالیت دونوں ایک ہی ہیں یا درحقیقت اشتمالیت جمہوریت کے لئے پیامِ موت ہے۔

جمہوریت دنیا کے لئے کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ افلاطون اور ارسطو سے لیکر اس وقت تک جمہوریت پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ریاستوں پر اس کے عملی تجربے بھی اُسی وقت سے جاری ہیں۔ ارسطو ہی کے زمانہ میں یونان کی شہری ریاستوں میں جمہوری حکومتیں موجود تھیں۔ لیکن اس کے بعد ایک زمانہ تک انسان جمہوریت کی طرف کوئی عملی قدم نہ بڑھا سکا۔ بڑی بڑی ملوکانہ حکومتیں قایم ہوئیں اور

صدیوں تک یہی سلسلہ جاری رہا - حتیٰ کہ روم اور فارس کی سامراجی ریاستوں کے کھنڈروں پر اسلام نے اپنی جمہوریت کی بنیاد رکھی - لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ جمہوریت اسلامی تعلیمات کا اثر تھی، بلکہ یہ نتیجہ تھی ایام جاہلیت کے عرب روایات کا - چنانچہ جوں جوں اسلامی فتوحات وسیع ہوتی گئیں مسلمان جمہوریت سے دور ہوتے گئے - عباسی حکومت تو تمام و کمال روم اور فارس کی حکومتوں کے انداز پر تھی - لیکن جہاں تک نظام معاشرت کا تعلق ہے جمہوریت برابر ترقی کرتی جارہی تھی اور اس لحاظ سے بیشک اسلامی خدمات بہت نمایاں ہیں -

موجودہ دور کی جمہوریت کا تعلق براہ راست انگلستان سے ہے - تقریباً ہزار صدی تک بیرونی حملہ سے محفوظ رہکر تدریجی رفتار سے انگلستان نے پایدار ترقی کی جو مثال پیش کی ہے اس کی نظیر دوسری جگہ ملنی محال ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انگلستان کی خاک میں کوئی ایسا اثر تھا یا وہاں جو لوگ آباد ہیں ان میں کوئی خاص خوبی ہے - جمہوریت ہو یا دوسری کوئی چیز کچھ نہ کچھ ہر قوم اور ہر فرد میں اس کا شائبہ موجود رہتا ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کو مناسب موقع مل گیا اور کسی کو نہیں - انگلستان کی جغرافیائی حالت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ایک جزیرہ ہونے کی وجہ سے بیرونی تاخت وتاراج سے محفوظ رہ کر بھی دنیا سے بالکل علٰحدہ نہ رہ سکا اور نئے نئے خیالات اور نئی نئی تحریکات سے ہمیشہ اثر پذیر ہوتا رہا اور چونکہ ملک کی اندرونی حالت بھی دوسرے ممالک کے مقابلہ میں غیر متموج رہی ملک تدریجی رفتار کے ساتھ ترقی کرتا رہا -

جمہوریت جس کا ایک ہلکا سا عکس انگلستان کے قدیم (Village + Parish moots) میں موجود تھا زمانہ کے ساتھ رنگ پکڑتا گیا - اگرچہ اس کی رفتار ہمیشہ ہموار نہیں رہی اور مد و جزر برابر ہوتے رہے لیکن اتنا ضرور تھا کہ دن بہ دن اس کا زور بڑھتا گیا - ۱۶۴۲ء کی خانہ جنگی اور ۱۶۸۸ء کے پُر امن انقلاب کے بعد انگلستان میں جمہوریت کے قدم اچھی طرح جم گئے اور مطلق العنانی کا ایک طرح سے خاتمہ ہو گیا - اٹھارویں صدی میں جمہوریت انگلستان سے نکل کر امریکہ اور فرانس میں پہونچ اور صرف اتنے ہی پر حد نہیں ہوئی بلکہ پورا یورپ جمہوریت کے لئے بیقرار نظر آنے لگا - ۱۸۴۸ء کے انقلاب کو صحیح معنوں میں جمہوریت اور ملوکیت کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ کہا جا سکتا ہے - اگرچہ اس کے بعد بھی یورپ سے ملوکیت کا خاتمہ نہیں ہوا پھر بھی اتنا ضرور ہوا کہ متمدن دنیا سے ملوکیت کے کوچ کا نقارہ بج گیا اور حکومتوں پر عوام برسر اقتدار نظر آنے لگے - جنگ عظیم کو بھی جمہوریت و ملوکیت کی جنگ کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ عظیم کے بعد دنیا کی تمام بڑی بڑی ریاستوں میں ملوکیت نام کو بھی نہیں رہ گئی - لیکن اس کے بعد ہی ایک دوسری چیز جمہوریت کی حریف بن کر آکھڑی ہوئی اور اسوقت تک اتنی تیزی سے زور پکڑتی جارہی ہے کہ اکثر جمہوریت کا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے - اس نئی قوت کے نام مختلف ممالک میں مختلف ہیں - لیکن درحقیقت ہر جگہ اس کی غرض و غایت ایک

ہی ہے ۔ یعنی عوام کی آزادی سلب کر کے ایک شخص یا ایک پارٹی کا برسرِ اقتدار ہو جانا ۔ کہیں اسے فاسزم کہتے ہیں، کہیں ناززم اور کہیں بولشوزم اور ہر جگہ اس کا آلۂ کار بھی ایک ہی ہے ۔ یعنی شخصِ واحد یا ایک منظم جماعت کی مطلق العنانی ۔

جمہوریت کے معنی ہیں کہ عنانِ حکومت عوام کے ہاتھ میں آجائے اور حکومت کا ہر کام عوام کے مشورہ سے عوام کے ہاتھوں اور عوام کے فایدہ کے لئے کیا جائے ۔

یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں کا یہ قاعدہ تھا کہ ریاست کے تمام اُمور براہ راست عوام ہی کے ذریعہ انجام پاتے تھے ۔ جب ضرورت ہوتی سارے شہر میں منادی کرا دی جاتی اور کل شہری جمع ہو کر بحث و مباحثہ کے بعد اتفاق رائے سے کچھ فیصلہ کر دیتے ۔ جس پر عمل کیا جاتا ۔ یہ ضرور تھا کہ اُمور سلطنت کی انجام دہی کے لئے کچھ مستقل ملازمین ہوا کرتے تھے ۔ لیکن ان کا تقرر بھی جمہوریت ہی کرتی تھی ۔ اس طرح کی جمہوریت کا امکان آجکل کی ریاستوں میں نہیں ہے کیونکہ اب ریاست اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ سارے کے سارے افراد کا ایک جگہ پر مجتمع ہو جانا ناممکن ہے ۔ موجودہ زمانہ میں اس طرح کی صرف چار ہی حکومتیں موجود ہیں ۔ جو سویزرلینڈ میں واقع ہیں اور رقبہ کے لحاظ سے بھی قدیم یونانی ریاستوں سے زیادہ نہ ہوں گی ۔

اس قسم کی جمہوریت (Direct Democracy) کہی جاتی ہے ۔ مروجہ جمہوریت کو (Representative Government) کہتے ہیں اس کا قاعدہ یہ ہے کہ عوام اپنے نمایندے منتخب کر لیتے ہیں جن کا کام ملک کے لئے قوانین وضع کرنا ہوتا ہے ۔ انھیں نمایندوں میں سے تنظیم و نسق سلطنت کے لئے بھی کچھ لوگ چنے جاتے ہیں جنھیں کابینہ کہتے ہیں ۔ عام دستور یہ ہے کہ پہلے کابینہ کا صدر منتخب کر لیا جاتا ہے ۔ جو اپنی مرضی کے مطابق نمایندوں میں سے اپنی کابینہ منتخب کرتا ہے ۔ صدر کا انتخاب انگلستان میں بادشاہ اور فرانس میں صدر جمہوریہ کرتا ہے عموماً صدر وہی ہوتا ہے جس پر اکثریت والی جماعت کو اعتماد ہو ۔ امریکہ کا قاعدہ اس سے کچھ مختلف ہے ۔ وہاں صدر جمہوریہ ہی کابینہ کے صدر کی خدمت بھی انجام دیتا ہے اور اس کی کابینہ کے ارکان عوام کے نمایندوں میں سے نہیں لئے جاتے بلکہ صدر اپنی مرضی کے مطابق ان کا انتخاب کرتا ہے ۔

انتظامِ ملک کی ذمہ داری کابینہ ہی کے سر ہوتی ہے اور اس کا تقریباً ہر رکن حکومت کے کسی نہ کسی شعبے کا صدر ہوا کرتا ہے ۔ لیکن ارکانِ کابینہ یا تو فرداً فرداً یا اجمالاً مجلسِ نمایندگان کے سامنے اپنے اقوال و افعال کے لئے جواب دہ ہوتے ہیں اور اسی مجلس کو ہر وقت اختیار رہتا ہے کہ ارکانِ کابینہ سے باز پرس کرے اور اگر ضرورت سمجھے تو انھیں برطرف بھی کر دے ۔ یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ جس طرح ارکانِ کابینہ مجلسِ نمایندگان کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں اُسی طرح مجلسِ نمایندگان بھی عوام کے سامنے جواب دہ ہے ۔

ان کو اپنے ہر قول و فعل کے لئے عوام کی خوشنودی درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام ناخوش ہوگئے تو آیندہ کے لئے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ قوم کی نظروں میں وہ ذلیل ہوجائینگے اور پھر ان کے ذمہ کوئی ملکی کام نہیں کیا جائے گا۔ (یہاں پر یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ امریکہ میں ارکانِ کابینہ مجلسِ نمایندگان کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے۔ ان کا تعلق براہ راست صدر سے ہوتا ہے اور صرف صدر ہی ان سے باز پرس کرسکتا ہے اور اگر چاہے تو انھیں برطرف بھی کرسکتا ہے) چونکہ اس قسم کی جمہوریت پر عوام کا قبضہ براہ راست نہیں ہوتا اور عوام نمایندوں کے وسیلے سے حاکم ہوتے ہیں اسے (Indirect Democracy) بھی کہتے ہیں۔

جمہوریت کے اس ڈھانچہ کو پیش نظر رکھ کر آیئے اب اس کے دعوؤں پر غور کریں اور دیکھیں کہ افراد جو توقعات اس سے رکھتے ہیں اور شخصی آزادی کی امیدیں جو اس سے بندھ گئی ہیں، درحقیقت انسان کے لئے فایدہ بخش بھی ہیں یا نہیں؟ اور اگر مفید ہیں تو کسی دوسری حکومت میں بھی ان کا امکان ہے یا نہیں؟ اشتمالیت کے ساتھ بھی ان کا نباہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

پہلی چیز جس کا وعدہ جمہوریت کرتی ہے وہ آزادی ہے۔ ایک جمہوری حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ افراد کو گفتار۔ کردار۔ تخیلات کی کامل آزادی دے۔ عوام کو اختیار ہو کہ وہ جو چاہیں اور جس طرح چاہیں کریں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ان کی آزادی دوسروں کی آزادی کے ساتھ متصادم نہ ہو جائے اور اگر ایسا نہیں ہے تو جمہوریت کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ محض قیام امن اور ملک و قوم کی ترقی تو ہر حکومت کی غرض ہوتی ہی ہے۔ جمہوریت کا مقصد تو یہ ہے کہ عوام الناس کو اس طرح کی تعلیم دے کہ ان کی ذہنی اور دماغی ترقی معراج کمال تک پہونچ جائے اور ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہوجائے کہ رموز سلطنت تک پیش پا افتادہ چیزیں معلوم ہونے لگیں۔ لیکن تاوقتیکہ عوام کو کامل آزادی میسر نہ ہو یہ ناممکن ہے، اس آزادی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں بہت سی پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ انسانی طبایع کا اختلاف ہے۔ انسانی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ مشکل سے دو آدمیوں کی رائیں آپس میں متفق ہوتی ہیں اور اگر انھیں من مانی کرنے کا موقع مل جائے تو نظم و نسق کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس برائی سے بچنے کا دوسری حکومتوں میں صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ شخصی آزادی پر کافی حد تک پابندیاں عاید کردی جائیں، لیکن جمہوریت اس کی جگہ خود عوام کے ہاتھوں میں حکومت کی ذمہ داری دیکر اس خامی کو خوبی میں بدل دینے کا ذمہ لیتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ فرد کو آزادی اُسی حد تک ملتی ہے کہ دوسروں کی آزادی میں مخل نہ ہو۔ مزید براں حکومت میں اپنا پلہ بھاری کرنے کے لئے ہر شخص اُن اشخاص کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہے جن کے خیالات زیادہ سے زیادہ اُس کے جیسے ہوتے ہیں۔ اس طرح شخصی آزادی کافی

حد تک جماعتی آزادی میں مبدل ہو جاتی ہے۔ پوری قوم مختلف جماعتوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور کئی منظم پارٹیاں قایم ہو جاتی ہیں۔ کامیاب جمہوریت کے لئے ان مختلف اور متضاد پارٹیوں کا وجود از بس ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک جماعت جو منظم اور بر سرِ اقتدار ہو گی (افراد کا تو ذکر ہی فضول ہے) دوسری جماعت کو فنا کر دیگی کیونکہ بہر حال ملک میں مختلف الخیال لوگ تو رہیں گے ہی۔ ہاں حکومت انھیں منظم ہونے کا موقع نہیں دے گی۔ مثال کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں روس، اٹلی اور جرمنی کی اندرونی حالت کا مطالعہ کافی ہوگا۔ ان ممالک میں حاکم جماعت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ وہ افراد اور جماعتیں جن کے خیالات ان سے مختلف ہیں عالم جانکنی میں سسکیاں لے رہی ہیں، اور ملک کی آدھے سے زیادہ آبادی غلاموں سے بدتر زندگی بسر کر رہی ہے۔ لیکن جمہوریت میں چونکہ ہر شخص اپنے جیسا کرنے کے لئے مختار ہوتا ہے آسانی سے بہت سی منظم پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ اسی لئے حکومت کسی خاص جماعت کی ملکیت نہیں ہو جاتی اور حکومت پر ہر جماعت کا تقریباً مساوی اثر رہتا ہے۔ حکومت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جو کچھ کرے کثرتِ آرا سے کرے اور سبھوں کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے کرے۔

یہ ضرور ہے کہ مطلق العنانی یا اشرافیت (ارسٹاکریسی) کے مقابلہ میں جمہوریت نہ تو اپنے اقدام میں کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ اُس حسن و خوبی سے انھیں انجام دے سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے یہاں کار آزمودہ لوگوں کے ہاتھ میں عنانِ حکومت نہیں ہوتی اور نہ یکجہتی و استقلال کا امکان ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جمہوریت کی یہ غرض بھی نہیں ہے، جمہوریت یہ قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہے کہ حکومت کا مقصد محض نظم و نسق کی آراستگی اور پیراستگی ہے۔ اس کا مقصد تو عوام الناس کو آراستہ و پیراستہ بنانا ہے، انھیں اس طرح کی تعلیم دینا ہے کہ یہ حقیقی معنی میں انسان بن جائیں اور بیشک اس لحاظ سے جمہوریت کا مقابلہ کوئی دوسری حکومت نہیں کر سکتی ہے۔ فی نفسہٖ حکومت انسان کا مقصودِ حیات نہیں ہے بلکہ یہ بھی کسی منزل تک پہونچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

جمہوریت کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ اشتمالیت کی طرح کل افراد قوم کو ایک ہی درجہ پر لاکر کھڑا کر دینے کی کوشش نہیں کرتی۔ بلکہ ہر فرد کو ترقی کے لئے مساویانہ موقع دیتی ہے۔ کسی پر محض اس لئے کہ وہ کسی مخصوص طبقہ سے تعلق رکھتا ہے کوئی راستہ بند نہیں کرتی۔ انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ حکومت اس کی مدد کے لئے ہمیشہ حاضر رہتی ہے۔ یہ بڑھے ہوؤں کو گھٹانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اس کی کوشش گھٹے ہوؤں کو بڑھانا ہے اور تا وقتیکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کا یہ مساویانہ حق حکومت نہ تسلیم کرلے صحیح معنوں میں جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکتی ہے اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو امریکہ اور انگلستان تک جمہوریت سے عاری نظر آئیں گے۔ امریکہ میں اگر آج دولت کی پرستش ہو رہی ہے تو انگلستان میں بھی قدیم روایات اور

خاندانی شرافت کا بُت لوگوں سے ابتک سجدۂ عبودیت وصول کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتک صرف سیاسیات میں جمہوریت کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تاوقتیکہ اجتماعیت کے ہر شعبے میں جمہوری نظام نہ قایم ہو جائے جمہوریت کی کامیابی دشوار ہے، گارنر (Garner) کا یہ قول بہت درست ہے کہ "جمہوریت بیک وقت ایک سیاسی نظام - معاشرتی حالت اور مذہبی تخیل ہے"۔

اشتمالیت اور جمہوریت کی بحث میں عموماً لوگ اس ذہنی مغالطہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ چونکہ جمہوریت ایک سیاسی نظام ہے اور اشتمالیت ایک معاشرتی حالت ہے دونوں ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہو سکتے اشتمالیت جس طرح ایک جمہوری حکومت میں ممکن ہے، اُسی طرح ایک مطلق العنان حکومت میں بھی اس کا امکان ہے، اگرچہ اشتمالی معاشرت میں جمہوری حکومت "نور علیٰ نور" کہی جائے گی۔ لیکن جمہوریت کے شرائط پر نظر غایر ڈالنے کے بعد یہ مغالطہ بآسانی دفع ہو جاتا ہے۔

جمہوریت کے لئے افراد کی آزادی سب سے ضروری شرط ہے، برخلاف اس کے اشتمالیت میں افراد کا کوئی شمار نہیں ہوتا۔ اشتمالی معاشرت کا پہلا کام یہی ہوتا ہے کہ فرد کی آزادی کو ختم کر دے اور یہ محض اسلئے کہ جمیع افرادِ معاشرت مساوی درجہ پر آجائیں، کیونکہ اشتمالی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ انسانی طبایع کی فطرت یکساں نہیں ہوتی اور تاوقتیکہ انھیں ایک راستے پر نہ لگایا جائے مساوات ہو بھی نہیں سکتی ہے۔ جمہوریت کے لئے بھی مساوات ضروری چیز ہے۔ لیکن یہاں برابری کے وہ معنی نہیں لئے جاتے جو اشتمالی لیتے ہیں۔ جمہوریت مساوات کی قایل ہے تو بس اسی حد تک کہ افرادِ معاشرت ایک نگاہ سے دیکھے جائیں اور سبھوں کے حقوق مساوی طور پر تسلیم کئے جائیں، قوی وضعیف، امیر و غریب کا توازن برابر کرنے کے لئے یہ کسی ایک کو گھٹانے یا بڑھانے کی قایل نہیں ہے۔ بلکہ فطرتِ انسانی کے فرق کو موزوں و مناسب گردانتے ہوئے اگر ایک طرف یہ ضعیف کے ترقی کے راستے کو صاف کرتی ہے تو دوسری طرف قوی کو بھی قوی تر ہونے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ لیکن اشتمالیت میں مساوات کے معنی اس کے بالکل برعکس ہیں۔ یہ مساوی حقوق دینے کی قایل نہیں ہے بلکہ اس کا مسلک عوام کی حق تلفی کر کے کسی کو کچھ زیادہ اور کسی کو کچھ کم دیکر سبھوں کو ایک مساوی سطح پر لا کر کھڑا کر دینا ہے۔ اشتمالیت میں مساوات مساوات کی چیخ صرف عوام کو فریب دینے کا ایک طریقہ ہے۔ ورنہ یہاں نہ آزادی ہے اور نہ مساوات اگر ہے تو صرف یہ کہ جس طرح بھی ممکن ہو معاشرت سے مختلف اور متضاد طبقوں کا خاتمہ کر دیا جائے محض معاشرت ہی معاشرت رہ جائے اور ہوبس (Hobbes) کا عینی لویاتھن (Levayathan) عالم تخیلات سے نکل کر عالم موجودات میں آجائے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیا جائے کہ مساوات کے وہی معنی صحیح ہیں جو اشتمالی لیتے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ آزادی جو جمہوریت کی روح ہے مساوات کی ضد ہے اور دونوں دوش بہ دوش نہیں چل سکتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اشتمالیت جمہوریت کے بالکل برعکس ہے۔ لیکن اشتمالی خوب جانتے ہیں کہ اگر وہ اس حقیقت کو قبول کر لیں تو یہ اپنے ہاتھ سے اپنے موت کے فیصلہ پر دستخط کرنے کے مصداق ہوگا۔ کیونکہ ایک Class کی حیثیت سے دنیا اب تک جمہوریت کا بدل نہیں پیش کر سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی تو مساوات کے معنی میں توڑ مروڑ کی حاجت پیش آتی ہے اور کبھی یہ کہکر دھوکہ دیا جاتا ہے کہ "متضاد طبقوں کا وجود جمہوریت کے منافی ہے اور چونکہ اشتمالیت معاشرہ سے مختلف طبقوں کو فنا کر دینے کا ذمہ لیتی ہے یہ اور جمہوریت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں"

لیکن ان سے کون کہے کہ جمہوریت کے لئے آزادی جتنی ضروری ہے اتنا ہی اہم مختلف پارٹیوں کا وجود بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کو پارٹی گورنمنٹ بھی کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں مخالف جماعت کے صدر کو حکومت مشاہرہ تک دیتی ہے اور یہ سمجھ کر دیتی ہے کہ جمہوری حکومت کے لئے مخالف جماعت ازبس ضروری ہے۔

گلاب چند

خواب کی دُنیا

از

عبد المالک آروی

آسٹریا کے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کی کتاب کی تلخیص، خواب کی ماہیت اور فلسفہ پر بہترین تصنیف مغربی اور مشرقی ادبیات کا دلچسپ اور مفید مجموعہ، زبان شگفتہ، انداز بیان محققانہ، اس کے پڑھنے کے بعد آپ خواب کے بہت سے معمے حل کر سکیں گے، اس میں ڈاکٹر فرائڈ کی تصویر و حالات زندگی اور پیش لفظ حضرت نیاز مدظلہ بھی شامل ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ مجلد عار۔ اراکین ادارہ سے صرف عہ اور عہ۔

پتہ:- معتمد اعزازی طاق بستاں آرہ

اُردو نثر سو سال میں کیا سے کیا ہوگئی

کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں ۔۔۔ رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا،
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا ۔۔۔ غنیمت ہے کہ ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

میر کا زمانہ اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے تھا اور انشاؔ کا سوا سو برس پہلے۔ دہلی اور لکھنؤ میں دونوں رہ چکے تھے اور دونوں میں ملاقات اور بات چیت بھی ہوئی تھی۔ اسوقت دنیا میں نہ گراموفون ایجاد ہوا تھا نہ ریڈیو نہیں تو آج آپ میر اور انشاؔ کی بولیاں بھی ریڈیو سے سُن لیتے۔ اب سے ڈیڑھ سو برس بعد کے لوگ آج کی ہندستانی زبان اُن ریکارڈوں کے ذریعہ سے سن سکیں گے جو آج بن گئے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے اُن کے زمانہ کی اور ہمارے آپ کے زمانہ کی بھی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویریں ہوں گی۔ سائنس کی ایجادوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ انگلستان اور آئس لینڈ سے جاپان اور فارموسا کے جزیروں کو اور ناروے ڈنمارک سے لیکر آسٹریلیا اور افریقہ تک اتنی لمبی چوڑی دھرتی کو جیت کر اپنی مٹھی میں کر لیا بلکہ وقت اور زمانہ گزرنے کے باوجود بھی زندہ رکھ سکیں گی اور ایک صدی کو دوسری صدی سے ایک جُگ کو دوسرے جُگ سے ملا دیں گی۔

نہ ازل ہے کچھ نہ ابد ہے کچھ یہی موت ہے یہی زندگی ۔۔۔ جسے وقت کہتے ہیں اہلِ دل وہ فنا بھی ہے وہ بقا بھی ہے

میں اپنے بچپن میں یہ تو دیکھتا تھا اور اس لئے سمجھتا بھی تھا کہ ایک دیس سے دوسرے دیس میں جا کر یا ہمارے لمبے چوڑے دیس ہی میں ایک صوبے سے دوسرے صوبہ میں جا کر بولی بدل جاتی ہے اور ہر جگہ کی الگ بولی ہوتی ہے اور ہر بولی زبان یا بھاشا میں نثر اور نظم ہوتی ہے اور کہیں کہیں ایک ہی بولی کی کئی بولیاں بن جاتی ہیں جیسے اودھ کے لوگوں کی ہندستانی، پورب میں غازیپور، بلیا اور بہار کے لوگوں کی ہندستانی یا پوربی ہندی اور کانپور، اٹاوہ، آگرہ میرٹھ، سہارنپور اور دہلی کے لوگوں کی ہندستانی یا پچھمی ہندی، برج بھاشا اور راجپوتانہ کی ہندستانی۔ جب میں کچھ بڑا ہوا تو لوگوں نے مجھسے کہا کہ ہر پانچ میل پر بولی بدل جاتی ہے۔ میرا دھیان بعد کو اس طرف بھی گیا کہ جہاں ایک جگہ کے رہنے والے عام طور سے ایک بولی بولتے ہیں وہاں بھی ہر ذات اور ہر پیشے کے لوگوں کی بولی میں کچھ نرالا پن ہوتا ہے، ان کے کچھ خاص محاورے ہوتے ہیں اور کچھ اپنے لفظ ہوتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کچھ گھرانوں اور کچھ لوگوں

کی اپنی بولی بھی ہوتی ہے چاہے یہ ان کی اپنی ایجاد ہو چاہے گزرے ہوئے زمانہ کی بولی کی یادگار ہو یا ممکن ہو کسی اور بھاشا کی پرچھائیں ان کی بولی پر پڑ رہی ہو۔ ابھی ایسے لوگ ہمارے صوبے میں موجود ہیں جو بھانجے کو بہن بیٹا، ہمارے پاس کو ہم پاس اور ہمارے کنے کہتے ہیں کبھی کو کبھو کہتے ہیں پانی پینے اور سگریٹ پینے کو جل کھانا یا سگریٹ کھانا اور منھ چومنے کو چُمّا کھانا بولتے ہیں۔ گھوڑوں کو گھوڑا لوگ پیڑوں کو پیڑ لوگ اور ہاتھی کے بچہ کو ہاتھی کا بلا بولتے ہیں۔ حالی کا ایک شعر ہے :-

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اس کے دوسرے مصرع کا مطلب ایک صاحب نے یوں فرمایا کہ ابھی بڑا بڑا لوگ پڑا ہے۔ میر انیس نے بارہا مجلس پڑھتے ہوئے کہا کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے۔ آزاد نے مصحفی کی زبان کے امروہہ پن کا ذکر کیا ہے۔ حفیظ جونپوری کہتے ہیں :-

تقلید لکھنؤ کی جو کرتا ہوں میں حفیظ، غیرت پکارتی ہے کہ اپنی زباں رہے

اخبار کو کاغذ کہتے ہیں۔ لفظوں کے چناؤ میں لفظوں کے مطلب میں لفظوں کی آواز میں بھی لوگوں کی بولیوں میں بڑا بھید ہے۔ بہار میں بولتے ہیں آپ کے شامل بدھنا ہے کسی اور جگہ کے لوگوں میں شامل کا یہ استعمال نہ دیکھا نہ سنا۔ مجھ سے اصغر گونڈوی نے کہا کہ ایک شعر میں انھوں نے پنپنے کا لفظ لکھا تھا ان کے اُستاد تسلیم لکھنوی نے فرمایا کہ پنپنا ہماری زبان کا لفظ ہی نہیں ہے اس کی جگہ پر انھوں نے لہلہانا تجویز کیا مگر اقبال کا مصرع ہے :-

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

یہ سب دیکھتے سنتے ہوئے بھی میں اپنے لڑکپن میں ایک بات نہیں سمجھا تھا یا کم سمجھا تھا وہ یہ کہ جگہ کے ساتھ ساتھ زمانہ بھی ہماری بولی ٹھولی کو بدل دیتا ہے ہاں ہر پانچ میل کی طرح ہر پانچ برس میں تو یہ اُلٹ پھیر پیدا نہیں ہوئی لیکن سو برس تک مشکل ہی سے کوئی زبان بے کچھ بدلے ہوئے رہ سکتی ہے۔ اور خاصکر اُردو ایسی ملی جلی ہوئی زبان جس کی رنگا رنگی شروع ہی سے مشہور تھی جو اپنے جنم دن سے انقلاب کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی اور جس نے تیزی سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں آنکھیں کھولی تھیں وہ اُردو جو نہ صرف بادشاہوں راجاؤں مہاراجاؤں کی بولی تھی نہ پنڈتوں یا عالم فاضل لوگوں کی، نہ صرف امیروں کی نہ صرف غریبوں کی بلکہ سب کی بولی تھی۔ سیکڑوں طرح کے پیشہ والوں سیکڑوں طرح کے مزاج والوں سیکڑوں ہزاروں طرح کے خیال اور بچار رکھنے والوں کے دلوں کی دھڑکن اور آواز کی لوچ سے بنائی رچائی اور سجائی جانے والی اُردو اور زمانہ کی طرح رنگ بدلنے والی اُردو۔

پچھلے سو برسوں کے اندر گنگا جمنا اور گومتی کے پلوں کے نیچے سے بہت کچھ پانی بہ چکا اور اس عرصے میں

یہ پُرانا ہندوستان کیا سے کیا ہو گیا۔ اور ہماری اُردو بولی اور اُردو نثر بھی کیا سے کیا ہو گئی۔ میں نے لگ بھگ ڈیڑھ سو برس پہلے کا کہا ہوا ایک شعر میرؔ کا اور ایک شعر انشارؔ کا آپ کو سنانا تھا۔ ان کو سن کر ہمارے کانوں کو یہ دشواش ہوتا ہے کہ جو اُردو بولی آج ہے وہی اُردو بولی تب بھی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے جیسے آج سے دو ڈھائی سو برس پہلے ولیؔ کا یہ شعر ہے :۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

اسے سنکر تو یہ دھوکا اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ اُردو زبان اور بولی ہمیشہ ایک ہی سی رہی ہے۔ لیکن یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اگر آپ انشا کی لکھی ہوئی رانی کیتکی کی کہانی سنیں یا پڑھیں۔ غزل میں ہزاروں جگہ پر انشارؔ وہی بولی بولتا ہے جو آج کی ہے لیکن اس کہانی میں دوسری بولی سنائی دیتی ہے اور یہاں انشاؔ کی آواز ہماری آواز سے نہیں ملتی۔ شاعری کی زبان میں وہ کس بل اور وہ سدا بہار اور سدا سہاگ نکھار ہوتا ہے کہ عام طور پر نثر کی زبان سے وہ زیادہ پرانی اور زیادہ نئی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کی بولی میں دو حصے ہوتے ہیں ایک حصہ وہ ہے جو نہیں بدلتا یا بہت کم بدلتا ہے دوسرا حصہ وہ ہوتا ہے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل جاتا ہے۔ جیسے میرؔ کے شعر کے اس ٹکڑے میں "ٹک چہرہ تو دیکھو میرؔ کا"۔ "ٹک" کا لفظ بعد کو ترک کر دیا گیا اور اس کی جگہ ذرا کا لفظ آ گیا میرؔ اور انشاؔ اور ان سے پہلے کی بھی اُردو شاعری میں اچھا خاصہ حصہ ایسا ہے جسے آج کی زبان کہہ سکتے ہیں لیکن اسوقت کی نثر میں بہت ہی کم حصہ ایسا ہے جسے آج کی زبان کہہ سکیں۔ کسی زمانہ کی نثر میں اس زمانہ کی بولی کے وہ حصے زیادہ کام میں لائے جاتے ہیں جو بدل جانے والے ہیں۔ نثر زیادہ تر ایک زمانہ کی چیز ہوتی ہے اور شاعری ہر جگ کی چیز ہوتی ہے۔ کسی نثر لکھنے والے کو بڑی تقدیر سے ایسی زبان نصیب ہوتی ہے جس کے پھول جلد ہی کمہلا نہ جائیں اور جن کی بو باس اور جن کا رنگ روپ سدا بہار ہو۔ سعدیؔ کی گلستاں ایسی ہی چیز ہے اور غالبؔ کے اُردو خط جن کی نثر سو برس پرانی ہو چکی ہے ان میں بھی آج ہی کی بولی ٹھولی سنائی پڑتی ہے۔ شعر کی زبان کا دور تک پہونچنے کا بھید اس کی پابندیوں میں ہے :۔

اہلِ جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں دل بڑھ گئے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

اور نثر کی زبان کا بظاہر وسیع تر ہونے کے باوجود بھی دور تک نہ پہونچنے کا بھید اس کی آزادیوں میں ہے :۔

رُک گئی راہِ جنوں راہ کی آسانی سے ہائے وہ وسعتِ صحرا بھی جو زنداں ہو جائے

قریب ڈیڑھ دو سو برس تک امیر غریب سب نے اُردو شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا بادشاہوں اور رئیسوں کے درباروں سے دل کھول کر شاعروں اور شاعری کی سرپرستی ہوتی رہی۔ نثر کی قدر و قیمت کو پہچاننا دنیا کی ہر قوم نے بعد کو سیکھا۔ یوں تو جب پہلے پہل انسان کچھ بولا ہوگا تو نثر ہی میں بولا ہوگا لیکن اس فطری عمل کو جب

انسان نے آرٹ کے سانچے میں ڈھالنا چاہا تو کلام موزوں یعنی شاعری کا سہارا لیا۔ اس لئے زندگی کی تاریخ میں تو پہلے نثر آئی لیکن آرٹ کی تاریخ میں پہلے نظم آئی۔ یوں سمجھئے کہ انسان کو کھڑا ہونا اور چلنا تو پہلے آیا لیکن اس فعل کو جب اس نے آرٹ بنانا چاہا تو پہلے اس نے ناچنا سیکھا ناچنے کے بعد کہیں شوخی رفتار اور سبک رفتاری کی نوبت آتی ہے۔ انگلستان میں تو بیکن اور ڈاکٹر جانسن انگریزی نثر نگاری کے بادشاہ ہوتے ہوئے بھی لاطینی نثر پر مٹے ہوئے تھے انھیں خود اپنی تحریروں کی قدر و قیمت نہیں معلوم تھی۔

اُردو نثر کو کسی لایق بنانے کا سہرا فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرائیسٹ کے سر ہے جناب رام بابو سکسینہ نے اُردو ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر گلکرائیسٹ کو اُردو کا ابو النثر (Father of Urdu Prose) کہا ہے۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اب سے قریب ایک سو چالیس برس پہلے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہندوستانی نثر کی داغ بیل ڈالی گئی اور ایک ہی وقت میں میر امن دہلوی، میر شیر علی جعفری افسوس دہلوی، میر بہادر علی حسینی دہلوی، سید حیدر بخش دہلوی، کاظم علی جوان، نہال چند، مرزا لطف علی، حفیظ الدین احمد، اکرام علی خاں، للو لال جی، مرزا علی لطف، بینی نراین جی، مولوی امانت اللہ، سید جعفر علی رواں لکھنوی، افتخار الدین علی خاں شہرت، عبدالکریم خاں کریم، مرزا ہاشم علی عیاں، مرزا قاسم علی ممتاز، مرزا جان طپش، مولوی خلیل اللہ اشک، مرزا محمد فطرت وغیرہ نے ہندوستانی نثر کے لٹریچر کی بنیادیں ڈال دیں۔ لیکن ابھی اُردو نثر یا تو بالکل بناوٹ اور دکھاوٹ کی چیز ہوتی تھی، یا جب رنگینی چھوڑ کر سادگی اختیار کرتی تھی تو بے رنگ اور بے نمک ہو جاتی تھی۔ ابھی اس کی زبان میں ذرا لڑکھڑاہٹ تھی۔ لیکن کام شروع ہو گیا تھا۔

لگ بھگ سو برس کے اندر اس داغ بیل کو پروان چڑھنے کے لئے خیر وہ ہوائیں تو نہ ملیں جو یورپ کی نثر کو ملیں پھر بھی کچھ ایسے جھونکے مل ہی گئے جن سے یہ بیل پنپ اُٹھی اور لہلہا اُٹھی۔ چھاپہ خانوں کا رواج ملک میں عام ہو گیا۔ ریلوں اور موٹروں نے صرف خط و کتابت کی نہیں بلکہ اخباروں اور رسالوں کے پرچار کی آسانی پیدا کر دی شاعری تو بغیر چھاپہ خانوں کے بھی اپنے سُر الاپ سکتی ہے لیکن عام طور پر گھر گھر نثر کی کتابوں اور اخباروں کا پرچار چھاپہ خانوں کے بغیر دھیان میں آ ہی نہیں سکتا۔ رفتہ رفتہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی ایک کونے میں اُردو اور ہندی کی جگہ مل گئی۔ پھر ملک کی سیاسی اور سماجی تحریکوں نے بھی ہندوستانی نثر میں نئی جان ڈال دی۔

اس سو برس کے اندر پہلا آدمی جس نے اُردو نثر کو اپنے قلم کی جنبش سے کہاں سے کہاں پہونچا دیا وہ محمد حسین آزاد ہے جس کی سات آٹھ ہزار صفحوں میں بکھری تصنیفوں کو ہم صرف جادو نگاری کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی ایک بے لاگ اور بے تکلف انداز بیان سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سرسید کی نثر میں ادبیت نہ سہی ایک بیدار مغز شخص کے دل اور دماغ کی دھڑکنیں سنائی دیجاتی ہیں۔ حالی نے بھی سنجیدگی متانت اور سلاست یعنی

کا اور ماتھے پر بغیر بل ڈالے ہوئے لکھنے کا وہ انداز اختیار کیا جو ان کی نثر اور نظم دونوں کی یکساں خصوصیت ہے اس کے بعد اُردو کے سب سے زبردست اہلِ قلم شبلی نعمانی کا نام آتا ہے جس کا کارنامہ اس دور کی سب سے اہم چیز ہے۔ جس طرح میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور سوزؔ اُردو شاعری کے چار رُکن ہیں اسی طرح آزادؔ، نذیر احمد، حالیؔ اور شبلیؔ اُردو نثر کے چار رکن ہیں۔

پھر دوسرا دور آتا ہے، رتن ناتھ سرشار کی نثر وہ لہراتا ہوا آئینہ ہے جس میں ہم اودھ کی تہذیب اور زندگی اور اس زمانہ کی بولی ٹھولی، اس کے تکلف اور اس کے ٹھٹھول سب دیکھ سن سکتے ہیں۔ اسی زمانہ میں شرر کی بھی اس نثر سے ہمارے کان آشنا ہوتے ہیں جو نہایت رچی ہوئی اور خوشگوار ہے۔ سجاد حسین اور اودھ پنچ کے نامہ نگاروں کے حلقہ نے نثر میں وہی کیا جو سوداؔ، انشاؔ، رنگینؔ اور جان صاحب نے نظم میں پہلے کیا تھا اور جو اکبر الہ آبادی اسی زمانہ میں کر رہے تھے۔ ان کے بعد پریم چند کے کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں اور جدید افسانہ نگاری اور ناول نگاری کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ پھر ہمیں ابوالکلام آزاد کی نثر کے نمونے ملتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ نیاز فتحپوری نے مختلف عنوانوں پر اپنی نثر کا نمونہ پیش کرکے دورِ حاضر میں پہلے پہل اسلوب (اسٹائیل) کی ایسی مثال پیش کی جس میں طرزِ بیان اور مفہوم دونوں الگ الگ اپنی دلکشی دکھاتے ہیں اور دونوں میں چولی دامن کا ساتھ بھی نظر آتا ہے۔ صحافت نگاری میں ظفر علی کی نثر، بانکپن کی مثال کے لئے مہدی افادی کی نثر، مضمون نگاری میں خواجہ حسن نظامی کی وہ نثر جس کا چھل بل اور البیلاپن اُردو میں ایک نئی چیز تھی اور دورِ حاضر میں پطرس اور رشید احمد صدیقی اور عظیم بیگ چغتائی کی پر طنز اور مزاحیہ نثر جو اودھ پنچ اور اس کے حلقہ کی نثر سے زیادہ لطیف بھی ہے اور زیادہ سنجیدہ بھی، مجنوں گورکھپوری کی نثر جسے ہم شبلی نعمانی کی نثر کا دوسرا جنم کہہ سکتے ہیں۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جن کا ذکر اس مختصر سی تقریر میں ممکن ہے۔ اُردو نثر نے صرف اب جاکر نثر کے اس بھید کو کچھ کچھ سمجھنا شروع کیا ہے جسے رازِ اسلوب (The Secret of Style) کہتے ہیں۔

سو برس کے اندر اُردو نثر کیا سے کیا ہوگئی لیکن ابھی اس کو بہت کچھ ہونا ہے، گو ہم اُردو نثر کے مستقبل سے مایوس ہیں، اور اس کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ

کارِ جہاں دراز ہے کچھ میرا انتظار کر

فراق گورکھپوری

ذہن نشین کر لیجئے کہ نگار کا پرچہ اگر آپ کو نہ ملے تو اسی مہینہ کے اندر دفتر کو اطلاع دیجئے۔ مہینہ گزر جانے کے بعد اور اس سے زیادہ دیر میں اطلاع آنے پر ۸ کے ٹکٹ پیشگی موصول ہونے کے بعد دفتر تعمیل کا ذمہ دار ہوگا۔ ورنہ نہیں۔ منیجر نگار

آئندہ جنگ اور ہماری صنعت و تجارت

دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا وجود محض اعتباری ہوتا ہے لیکن ہم اپنی عمریں اُن کے حصول کی کوشش میں صرف کر دیتے ہیں اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو ایک ناگزیر حقیقت ہیں لیکن ہم ہمیشہ اُن سے بچنا چاہتے ہیں، پہلی چیز کی مثال امن و سکون ہے جو بالکل اعتباری چیز ہے اور دوسری کی جنگ و جدال۔

اسوقت دنیا میں دو اسکول ہیں جو جنگ کی بابت دو مختلف نظرئے رکھتے ہیں، ایک برن ہارڈی اور نیٹشے کا اسکول ہے جو دنیاوی ترقی کا سرچشمہ اسی جذبۂ جنگ و مسابقت کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا برائس، نارمن، برٹرانڈ رسل وغیرہ کا جو جنگ کو بدترین لعنت سمجھتا ہے،

اس میں شک نہیں کہ امن و سکون کی خواہش فطری ہے، لیکن دنیا کی ترقی نام ہے صرف اضطراب کا اور اگر انسان ایک جگہ چین سے خاموش بیٹھ جائے تو پھر اس کے بعد دوسری منزل موت ہی ہے۔ کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ دنیا کے بہت سے علمی اکتشافات، اور صنعتی اقدامات کا سبب صرف یہی بین الاقوامی مغایرت ہے اور امن و سکون کے زمانہ میں علوم و فنون کی تحقیق پر اتنا روپیہ صرف نہیں کیا جاتا، جتنا جنگ کے زمانہ میں۔

دنیا میں بہت سی علمی و صناعی ترقیاں صرف اس وجہ سے ہوئیں کہ ایک ملک جنگ سے تباہ ہو گیا اور پھر اسے اپنے نقصانات کی تلافی اور حصول دولت و اقتدار کے لئے نئی نئی راہیں ڈھونڈھنا پڑیں۔ مرکبات نائٹریٹ طیار کرنے کی صنعت میں جو ترقی جرمنی نے کی ہے اور (Al Kali) کی تجارت میں فرانس نے جو کچھ کمایا ہے وہ جنگ عظیم ہی کا نتیجہ ہے۔ جاپان کی مختلف صنعتوں کی ترقی ۱۹۰۵ء کی لڑائی کا تتمہ ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم کی وجہ سے جن علوم و فنون میں غیر معمولی ترقی ہوئی، ان میں سے ایک فن پرواز ہے اور دوسرا زیر آب جہاز رانی، علاوہ ان کے سمعیات (Acoustics) اور لاسلکی مخابرات کے متعلق جو ترقیاں ہوئی ہیں وہ بھی جنگ کی ممنون کرم ہیں۔ سر رابرٹ جونس کا بیان ہے کہ سرجری کا جسمانی نقایص دور کرنا اور بدصورتی کو حسن میں تبدیل کر دینا، یہ بھی جنگ کی پیداوار ہے الغرض طبیعیات اور کیمیا کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس کی ازسرِ نو چھان بین نہ کی گئی ہو، اور نئے نئے اکتشافات و اختراعات سے علوم و فنون کو ترقی نہ ہوئی ہو۔

پھر طیاری جنگ کے سلسلہ میں یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ کتنے بیروزگار کام سے لگ جاتے ہیں۔ برطانیہ نے حال ہی میں ۱۵۰۰ ملین پونڈ اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے منظور کئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزی صنعت جو اسوقت تنزل کی حالت میں ہے ترقی کر جائے گی اور لاکھوں کام کرنے والے جو فاقہ کر رہے ہیں برسرکار ہو جائیں گے۔

جرمنی میں بھی طیاری جنگ نے بیروزگاری کا خاتمہ کر دیا ہے اور اب ہر شخص وہاں مصروف کار نظر آتا ہے۔

اس لئے سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی مدافعت کے لئے یہاں کی افواج کا اکثر حصہ ہندوستانیوں کے لئے وقف کر دیا جائے اور اُن کی میکانکی آراستگی کے لئے یہیں آلات حرب و دفاع طیار کئے جائیں تو کیا یہاں کی اقتصادی مشکلات اور بیروزگاری پر اس کا اثر نہ پڑے گا؟

ہندوستان کی آبادی بہ لحاظ دولت دو حصوں میں منقسم ہے، ایک غریب دوسرا مالدار، متوسط الحال طبقہ یہاں مفقود ہے۔ غریب طبقہ میں بڑا حصہ کاشتکاروں کا ہے جو سال میں چھ مہینے بالکل بیکار بیٹھے رہتے ہیں اور مالدار طبقہ کی حالت یہ ہے کہ اس کی دولت مدفون رہتی ہے اور اس سے ملک کو کوئی فایدہ نہیں پہونچتا اگر حربی صناعت کو یہاں رائج کیا جائے تو بیکار جماعت کا بھی بڑا حصہ باکار ہو سکتا ہے اور لوگوں کی جمع کی ہوئی دولت بھی ٹھکانے لگ سکتی ہے۔

اس وقت ہندوستان کی سوشلسٹ جماعت کئی حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ اُن چند افراد پر مشتمل ہے، جنھوں نے ملک کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اور جن کو ملک کی بڑی آبادی کا اعتماد حاصل ہے۔ ان کے بعد دوسری قسم ڈرائنگ روم بالشیوکیوں کی ہے جو قیمتی کاروں میں بیٹھکر آتے ہیں اور سرمایہ داری کے خلاف نہایت پرجوش تقریریں کرتے ہیں، لیکن خود ان کی زندگی کمیہ سرمایہ دارانہ ہے۔ ایک جماعت اُن چھٹ بھیّوں ([illegible]) کی ہے، جو سرمایہ دار طبقہ کی مخالفت صرف اس لئے کرتی ہے کہ سیاست کے میدان میں وہ آگے آجائے۔ یونیورسٹی سے نکلی ہوئی نوجوان جماعت زیادہ تر کارل مارکس کے نظریہ کی شیدا ہے، لیکن عملاً وہ کچھ نہیں ہے۔

ایک اور جماعت ہے جو اپنے نصب العین کے لحاظ سے صرف روحانیت کی پرستار ہے، وہ اہنسا کا پرچار کرتی ہے اور مشینوں کے ذریعہ سے زرعی و صنعتی ترقی کو ہندوستان کے لئے مفید نہیں سمجھتی وہ چھوٹی چھوٹی خانگی صنعتوں کو بڑی بڑی مشینوں سے چلائی جانے والی صنعتوں پر ترجیح دیتی ہے، کیونکہ اس کے نزدیک ہندوستان کی کثیر آبادی اس طرح بیکار ہو جائے گی۔ لیکن اس کا یہ خیال صحیح نہیں، ہندوستان کی دستی صنعتوں کے زوال کا سبب صرف یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کی بنی ہوئی چیزوں سے ہمارے بازار بھرے پڑے ہیں اور خود ہمارے ملک میں کوئی صنعت وسیع پیمانہ پر ایسی نہیں ہے جو ملک کی ضروریات کو پورا کرے۔ بڑے بڑے صنعتی اداروں نے کبھی خانگی صنعتوں کو برباد نہیں کیا، بلکہ ان کو اور ترقی دی ہے، جس کا ثبوت جاپان سے مل سکتا ہے۔

ہندوستان، اسی کرۂ زمین کا ایک حصہ ہے اور وہ اس اُصول سے ہٹ کر کامیاب نہیں ہو سکتا جس پر اس وقت ساری دنیا کاربند ہے ۔ اخوت عامہ یا انسانیت پرستی کا وہ دور ابھی نہیں آیا ہے اور نہ شاید کبھی آئیگا جب کرۂ ارض کی تمام حکومتیں آپس کی جنگ و جدال کو ختم کر دیں گی ۔ یہ زمانہ وہ ہے جب ہر ملک دوسرے ملک کو فنا کر دینا چاہتا ہے اور واقعی فنا کر دیتا ہے اگر کسی میں مقابلہ کی تاب نہیں ہوتی، پھر دیکھئے کہ مقاومت کی کامیابی کا انحصار کس چیز پر ہے، صرف صنعت و تجارت کی ترقی پر اور خود ملک کی پیداوار سے ملک کی ضروریات فراہم کرنے پر۔

اس سے قبل ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ فوجی نقطۂ نظر سے ہندوستان بالکل غیر محفوظ ملک ہے، یعنی اگر برطانوی فوجیں یہاں سے چلی جائیں، تو پھر ہم چھوٹے سے چھوٹے حملہ آور ملک کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اور اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں جبریہ فوجی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے اور یہاں کی فوجوں کی تنظیم یہیں کی آبادی سے کیجائے اور تمام آلاتِ حرب یہیں طیار کئے جائیں، اس سے ایک فائدہ ہوگا کہ ملک کی مختلف صنعتیں غیر معمولی ترقی کر جائینگی بے روزگاری بڑی حد تک دور ہو جائے گی اور چند سال میں ہندوستان اپنی حفاظت کے لئے انگریزوں کی مدد سے بے نیاز ہو جائے گا۔

ضروریاتِ جنگ میں سب سے پہلی چیز پٹرول ہے، جو ہوا، پانی اور خشکی میں ہر جگہ بکثرت استعمال ہوتا ہے جاپان کو موجودہ جنگ میں اتنا پٹرول صرف کرنا پڑا ہے کہ وہاں اس کا قحط ہو گیا ہے اور تقریباً تمام کرایہ کی موٹروں، ٹراموے گاڑیوں اور ذاتی موٹروں کو کوئلہ استعمال کرنا پڑ رہا ہے ۔ پٹرول کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیائے سیاسیات کے بہت سے اہم مسائل اسی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ امریکہ کی ڈالر پالیسی اور یورپ میں توازنِ قوت کا مسئلہ انھیں لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے، جو پٹرول کی تجارت کے ناخدا ہیں ۔ ایران میں بیجا مداخلت کرنا، برما پر قبضہ کر لینا محض پٹرول کی وجہ سے تھا ۔ اتحادیین کی نگاہ میں ترکی اس لئے غدار تھا کہ موصل و عراق کے پٹرولی چشمے اس کے پاس تھے ۔ امریکہ کا مکزیکو اور وسط امریکہ پر اپنا اقتدار قائم کرنا اسی پٹرول کی طمع سے تھا اور جاپان کا علاقۂ بیکال اور جزیرۂ سگالین پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا بھی پٹرول ہی کی وجہ سے ہے، الغرض پٹرول کی اہمیت اس زمانہ میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ بغیر اس کے نہ جنگ ہو سکتی ہے نہ کوئی صنعت ترقی کر سکتی ہے۔ چنانچہ جرمنی نے حال ہی میں مکزیکو سے پندرہ ملین پیپے اور رومانیا سے پانچ ملین پیپے اپنی مصنوعات کے تبادلہ میں حاصل کئے ۔ ہندوستان میں بدقسمتی سے پٹرول بہت کم پیدا ہوتا ہے، اور یہ تمام ہندوستان دونوں جگہ کی پیداوار صرف ۳۵۰ ملین گیلن ہے جو امن کی حالت میں بھی ہندوستان کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی اور باہر سے منگانا پڑتا ہے ۔ آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ علاوہ پٹرول کے دوسرے معدنی تیلوں پر بھی ۷ کرور سالانہ صرف ہوتا ہے ۔ پھر اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں پٹرول کے چشمے نہیں ہیں بلکہ

اس طرف توجہ نہیں کی جاتی - ماہرین طبقات الارض کا اندازہ ہے کہ کشمیر، نیپال اور ہمالیہ کی ترائی میں پٹرول کے چشمے بہ کثرت مل سکتے ہیں اگر جستجو کی جائے، اسی کے ساتھ کوئلہ کی گیس بنانے کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے جس کے مصارف بہ نسبت پٹرول کے بہت کم ہوتے ہیں، اور ایک لاری روپیہ کے کوئلہ میں اتنا ہی سفر کر سکتی ہے جتنا پانچ روپیہ کے پٹرول میں - الغرض ہندوستان میں پٹرول اور کوئلہ کی گیس کی طرف توجہ کی جائے تو اس کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوگا کہ یہاں کا بہت سا روپیہ باہر نہ جائے گا بلکہ جنگ کے وقت ہم دوسرے ملکوں کے محتاج نہ رہیں گے اور ہمارے لاکھوں آدمی جو اسوقت بیروزگار ہیں کام سے لگ جائیں گے۔

دوسری چیز لاکھ ہے جو ہندوستان کی خاص چیز ہے اور کروڑوں من یہاں سے یوروپ و جاپان کو جاتی ہے جہاں اس سے رنگ، پالش، گراموفون رکارڈ، لیتھو روشنائی اور بجلی کے (Insulation) اس سے طیار ہوتے ہیں - گزشتہ جنگ کے زمانہ میں لاکھ کی مانگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ دوسرے ملکوں میں اس کی برآمد روک دینی پڑی اور انگلستان نے اس سے بہت فائدہ اُٹھایا - اگر ہندوستان میں لاکھ کو صاف کر کے انھیں مصنوعات کو یہاں طیار کیا جائے جو دوسرے ملکوں میں طیار کی جاتی ہیں تو ملک کی خوشحالی کتنی وسیع ہو سکتی ہے۔

نباتاتی تیل (جو فنی آلات حرب اور میکانکی نقل و حرکت میں بہ کثرت استعمال ہوتا ہے) زیادہ تر باہر سے آتا ہے حالانکہ جن خام چیزوں سے یہ تیل نکالا جاتا ہے ان کا بڑا حصہ تخمیناً دس گیارہ کروڑ سالانہ کا ہندوستان ہی سے باہر جاتا ہے - اگر ان درختوں کی کاشت یہاں زیادہ وسیع پیمانہ پر کی جائے اور تیل بھی یہیں نکالا جائے تو ہماری آمدنی کئی گنی بڑھ سکتی ہے اور جنگ کے وقت نباتاتی تیل کے لئے ہم دوسرے ملکوں کے دست نگر نہیں رہیں گے۔

آئندہ جنگ کی طیاری کے لئے علاوہ ان چیزوں کے اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ موٹر سازی کی صنعت کو یہاں ترقی دیجائے جو اسباب تجارت کے نقل و حرکت کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے جس سے ہم اپنی فوجوں کو بھی میکانکی اصول پر آراستہ کر سکتے ہیں - فرض کیجئے اگر دشمن کے حملہ سے ہماری ریلوے سروس بیکار ہو جائے تو پھر سوائے اس کے کہ موٹروں سے کام لیا جائے اور کیا ہو سکتا ہے - چین نے اس جنگ میں جتنا قرض لیا اسکی بڑی مقدار صرف موٹروں کی خریداری پر صرف ہوئی کیونکہ بغیر ان کے سامان حرب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ ہو سکتا تھا، نہ رسد رسانی آسانی سے ممکن تھی انھیں موٹروں کے کارخانوں میں تمام ہوائی جہازوں کے انجن بھی طیار ہونا چاہئے خواہ وہ مصافی ضرورتوں کے لئے درکار ہوں یا غیر مصافی ضرورتوں کے لئے کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انگلستان آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ سے تو انجن طلب کرتا ہے لیکن ہندوستان کی طرف اس کا خیال بھی نہیں جاتا جہاں خام پیداوار کی کثرت اور سستی مزدوری کی وجہ سے اس صنعت کی ترقی کے امکانات بہت زیادہ ہیں - ملک کی مدافعت کے لئے مسلح کاروں اور منتقل ہونے والی توپوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور

ان کی طیاری بھی ہندوستان میں ممکن و آسان ہے۔ مثلاً ہمیں روس کو دیکھنا چاہیئے جواب سے چند سال قبل ہر مشینری باہر سے طلب کرتا تھا، لیکن اب یہ حال ہے کہ موٹر، ہوائی جہاز، ٹینک، مسلح گاڑیاں وہ خود چین، ترکی، افغانستان، ایران، اسپین اور میگزیکو کو فراہم کرتا ہے۔ اس وقت ہندوستان اقتصادی حیثیت سے بیس سال قبل کے روس سے کہیں زیادہ مضبوط ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ روس تو اتنی گری ہوئی حالت سے اس قدر ترقی کر جائے اور ہمارے لئے ممکن نہ ہو۔

یوروپ و امریکہ کے مصنوعات جنگ پر ہندوستان کو بھروسہ کر کے بیٹھ جانا انتہائی حماقت ہے کیونکہ اول تو وہاں کی گراں مزدوری اور خام پیداوار کی کمی کی وجہ سے یہ صنعتیں خود غیر یقینی کیفیت رکھتی ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ خود اپنی مدافعت کی طرف سے اس قدر فکر مند رہتے ہیں کہ ہندوستان ان کی مدد پر بھروسہ نہیں کر سکتا خصوصیت کے ساتھ جنگ کے وقت کہ نقل و حرکت کے ذرائع محدود و خطرناک ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اس وقت ریلوں کی کثرت اتنی ہے کہ کسی ملک میں نہیں اور یہاں تین چار بڑے بڑے ورکشاپ بھی موجود ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ انجن وغیرہ سب باہر ہی سے آتے ہیں اور اس وقت تک دو ارب روپیہ اس سلسلہ میں انگلستان پہونچ چکا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں انجن طیار نہیں ہو سکتے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ چھوٹی لائن کے انجن ایک انجنیر نے یہیں اجمیر میں طیار کر کے دکھا دئے جن کی قیمت دس ہزار روپیہ ولایتی انجن سے کم ہوتی ہے۔

اگر ریلوے کے کارخانوں کو وسعت دیکر یہیں انجن بھی بنائے جائیں تو بڑی آسانیاں ممکن ہیں کیونکہ لوہے کی یہاں کمی نہیں اور مزدوری کی ارزانی ظاہر ہے، علاوہ اس کے جنگ کے زمانہ میں باہر سے انجن بھی فراہم نہیں ہو سکتے اور دشمن سب سے پہلے انجنوں ہی پر قبضہ کرتا ہے۔ حال ہی میں جاپان نے ۸۴ انجن چین کے چھین لئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرصہ تک فوجوں کی نقل و حرکت نہ ہو سکی۔

اگر یہاں ریل کے کارخانوں میں انجن بھی طیار ہونے لگے تو ٹینک، بھاری بھاری توپیں، توپخانوں کی گاڑیاں بھی یہیں بننے لگیں گی جن کی جنگ کے وقت سخت ضرورت ہوتی ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں یوروپ کے تمام ریلوے ورکشاپ سے یہی کام لیا جاتا تھا کیونکہ باہر سے ان چیزوں کی فراہمی ممکن نہ تھی۔

یہ یقینی ہے کہ ہندوستان اقتصادی حیثیت سے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک مشینری اور اوزار بنانے کی صنعت کو یہاں ترقی نہ دیجائے۔ اس وقت ہم تمام اوزار یا مشینیں جو بھاری صنعت کے لئے درکار ہوتی ہیں باہر سے طلب کرتے ہیں یہاں تک کہ پانی کا پمپ بھی باہر سے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دو کارخانے جو یہاں ہیں بھی وہ حکومت کی مدد نہ ملنے سے ترقی نہیں کر سکتے۔ ٹاٹا کمپنی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ

لوہے کی ہر طرح کی مصنوعات یہاں طیار ہو سکتی ہیں اور دنیا کی کوئی مشینری ایسی نہیں ہے جو یہاں نہ بن سکتی ہو۔ ہندوستان لوہے کی پیداوار میں امریکہ کے بعد دوسرے درجہ کا ملک سمجھا جاتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس سے خود ہندوستان کو کوئی خاص فایدہ نہیں پہونچتا اور وہی خام لوہا جو یہاں سے کوڑیوں کے مول جاتا ہے مشینری کی صورت میں ہم اس کی قیمت ہزاروں لاکھوں ادا کرتے ہیں۔ یہی حال اُن کیمیاوی چیزوں کا ہے جو دواسازی یا دوسری صنعتوں کے لئے درکار ہوتی ہیں، تین کرور سالانہ سے زیادہ کے تو مرکبات نوسادر اور سوڈا طلب کئے جاتے ہیں اور دو کرور کے وہ مرکبات کیمیاوی جو دواسازی کے کام آتے ہیں۔ حالانکہ ان میں کوئی ایسا نہیں جو یہاں طیار نہ ہو سکے۔ تانبہ، نکل، الومنیم، ٹین وغیرہ بھی سامان جنگ کی طیاری میں بہت کام آتا ہے اور یہ سب چیزیں ہندوستان میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ربڑ بھی جنگ میں درکار ہوتا ہے اور چمڑا بھی، لیکن نہ ربڑ کی کاشت کو یہاں وسیع کیا جاتا ہے اور نہ چمڑے کی کھپت کا انتظام ہوتا ہے۔

الغرض ہندوستان کی اقتصادی تباہی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں صنعت کی ترقی کی راہ میں موانع حایل کئے جاتے ہیں اور اس کی خام پیداوار سے سفید اقوام کو فایدہ اُٹھانے کا موقع دیا جاتا ہے جس کا حقیقی احساس اسوقت ہوگا جب دنیا میں آتش جنگ مشتعل ہوگی اور ہم انگلستان کی مدد پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو پامال ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔

چند قابل مطالعہ کتابیں

قوم کی آواز:۔ مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس کی تقریروں کا مجموعہ اور سفر یورپ کے حالات مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب قیمت عمہ

آزادی:۔ یہ جان اسٹورٹ مل کی کتاب "لبرٹی" کا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ ہے جو سیاسیات کے درس کا ایک اہم جزو ہے۔ قیمت عہ

تلاش حق:۔ (جدید ایڈیشن) مہاتما گاندھی کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب جلد اول ہے جلد دوم عمہ

میری کہانی:۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اُردو ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت مجلد دو حصے للعہ

عربوں کا تمدن:۔ جوزف ہیل کی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے، مسلمانوں کے قدیم اور علمی کارناموں کو بیان کیا گیا ہے، مترجمہ سید نذیر نیازی صاحب بی، اے (جامعہ) قیمت صرف عہ

تاریخ فلسفۂ اسلام:۔ مشہور جرمن فلسفی ٹ، ج دی بوئر کی مقتدر تصنیف کا اُردو ترجمہ از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (طبع ثانی) قیمت عہ

جاپان:۔ جاپان کے حالات پر سیر حاصل بحث۔ مجلد عمہ

منیجر نگار لکھنؤ

شاہجہاں کی بیٹیاں

(ایک انگریز کی نظر میں)

مسٹر ایف - جے - مورگن کا طویل سلسلۂ مضامین "تاریخ ہند کی مشہور خواتین" کے عنوان سے "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" کی متعدد اشاعتوں میں شایع ہوچکا ہے۔ اس سلسلہ کی وہ کڑی جو شاہجہاں کی لڑکیوں سے متعلق ہے، اخلاق سوز اور دلآزار ہونے کے علاوہ تاریخی اعتبار سے بھی بے حد گری ہوئی ہے۔ مسٹر مورگن کا ماخذ برنیر ہے اور اس کی لغو غیر ذمہ دارانہ تحریروں کا علم ہر اس شخص کو ہے جس نے تاریخ ہند کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے۔

فرانکوئس - جے - برنیر ۱۶۵۹ء سے ۱۶۶۸ء تک ہندوستان میں مقیم رہا۔ وہ مغلیہ دربار کے ایک امیر دانشمند خاں کے ہاں ملازم تھا اور حرم شاہی میں، جہاں اطبا بھی آنکھوں پر پٹی باندھکر اور برقعہ اوڑھکر صرف ضرورتاً بلوائے جاتے تھے، اسے بالکل رسائی حاصل نہ تھی۔ اس لئے حرم شاہی سے متعلق اس کی تمام معلومات دہلی کی بازاری گپوں اور افواہوں کی پیداوار تھیں۔

مسٹر مارگن اگر فارسی کی تاریخوں سے استفادہ کرنے کے اہل نہ تھے تو کم از کم نکولاؤ مانچی کی تصنیف اسٹوریا ڈو موگور کو دیکھتے جو زوائد اور لغویات سے تو بری نہیں تاہم ایک حد تک قابل لحاظ ہے کیونکہ اس سیاح کا قیام ہندوستان میں برنیر کی مدتِ قیام سے کہیں زیادہ رہا۔

مانچی نے برنیر کو دہلی میں دیکھا بھی تھا اور اکثر و بیشتر جبکہ وہ اپنی شہرۂ آفاق اسٹوریا کی ترتیب میں مصروف تھا اس نے برنیر کی متعدد تاریخی غلطیوں کو درست بھی کیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"میں نے اکثر اس کو تنبیہ کیا کہ عوام کی باتوں پر یقین نہ کرے"

یہاں پر یہ ظاہر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جہاں آرا کے فرضی عاشق کے جلا دئے جانے کا قصہ جو

لہ برنیر کا سفرنامہ از کانسٹیبل صہ۱۳

مسٹر مورگن نے بیان کیا ہے وہ سوائے برنیئر کے اور کسی تاریخ میں نہیں ملتا اور مانچی نے اس قصہ کی کھلے الفاظ میں تردید بھی کردی ہے، وہ لکھتا ہے :-

"اس نے (جہاں آرا بیگم نے) اپنے بھائی کے لئے تاج حاصل کرنے کی بہت کوشش کی تھی کیونکہ دارا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ ہوجانے کے بعد وہ اسے عقد کی اجازت دیدے گا، اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاں آرا نے اپنی تمام قوت اپنے باپ (شاہجہاں) کو خوش کرنے کے لئے استعمال کردی اور ان کی خدمت گزاری انتہائی محبت اور محنت سے کی تاکہ وہ بھی اس کی درخواستوں کو قبول کرلیں۔ اسوجہ سے عوام میں پیشگوئیاں شروع ہوگئیں کہ شاہجہاں کو اس سے جنسی تعلق ہے اور برنیئر نے ان کو صحیح سمجھ کر لکھ مارا، حالانکہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ یہ معلوم کرکے کہ شہزادی کا ایک چاہنے والا محل میں موجود ہے شاہجہاں اس کی گرفتاری کے لئے روانہ ہوگیا۔ شاہزادی نے اس شخص کو ایک دیگ میں چھپا دیا اور بادشاہ نے اس کو آگ پر رکھوا دیا۔

کیا شاہجہاں ایسی شاندار سلطنت میں جہاں سفراء دولِ بکثرت موجود ہوں، اپنی بیٹی سے ایسا سلوک کرسکتا تھا"[1]

گو یہ اقتباس برنیئر اور اس کے محروم البصیرت متبعین کی تردید و تکذیب کے لئے کافی ہے، مگر اس کے معنے یہ نہیں کہ خود مانچی جو اپنے آپ کو برنیئر سے بہتر مورخ ثابت کرنا چاہتا ہے، قابلِ اعتبار تھا۔ کہیں کہیں وہ اخلاقی دناءت میں برنیئر سے کئی قدم آگے نظر آتا ہے، اس نے اپنا اقتدار ظاہر کرنے کے لئے عجیب عجیب حرکتیں کی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے[2] کہ جہاں آرا خود اپنے پینے کی خاص شراب اسے بھیجا کرتی تھی[3]۔ اور دوسری جگہ یہ رائے زنی کرتا ہے کہ :-

"یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس شہزادی نے اپنے باپ کی خدمت گزاری کرنے سے گریز نہیں کیا اور صرف اپنے عشاق سے لطف اندوزی پر اکتفا کیا"[4]۔

قبل اس کے کہ مانچی کی مورخانہ حیثیت پر تفصیل سے تنقیدی نظر ڈالی جائے، یہ واضح کردینا بیجا نہ ہوگا کہ اگر مسٹر مورگن صرف سرکار ہی کی تصانیف کا مطالعہ کرلیتے تو ان کو حقیقت کا علم ہوجاتا۔ سرکار لکھتے ہیں :-

"جہاں آرا، شاہجہاں کی عزیز ترین اولاد تھی اور اس کی محبت کی ہر طرح مستحق تھی۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد اس کی دیکھ بھال اور عاقبت اندیشی نے شاہجہاں کو خانگی تفکرات سے نجات دیدی تھی۔ اس کی شیریں مزاجی اور دلی شرافت نے اس کے دماغی[5] کمالات سے کہیں زیادہ، درماندگی اور پریشانی میں بادشاہ کو سکون بخشا تھا۔ اسکی مشفقانہ محبت نے تمام خاندانی تلخیوں کا علاج کردیا تھا اور خود اس نے اپنے اعزہ و اقربا کے تنگ دائرے سے باہر بھی اسے

---

[1] "اسٹوریا" جلد اول ص ۲۱۰-۲۱۲ — [2] اسٹوریا جلد دوم ص ۱۱۵ — [3] جلد اول ص ۲۰۲ — [4] اسٹوریا جلد اول ص ۲۱۹ — [5] جلد دوم ص ۲۱۸

[6] اندرام مخلص اپنی کتاب چمنستان ص ۲۵ پر لکھتا ہے کہ جہاں آرا بعض مذہبی رسایل کی مصنفہ بھی تھی، اسٹوریا جلد اول ص ۲۱۶۔ دلیم اردن کی نوٹ ۲۔

یتامیٰ، بیوگان اور غربا و مساکین کے لئے شاہانہ فیاضیوں کا ذریعہ بنا دیا تھا، کامیابی و نصرت کے درخشاں ایام میں اسکا نام تمام ملک میں صرف فیاضی و سخاوت کے لئے روشن تھا مصیبت کے زمانہ میں اس کے فضایل اور بھی زیادہ عالیشان بلندیوں پر پہونچ چکے تھے"۔

یہاں تک تو مسٹر مورگن کی تالیف قلب کے لئے "گزارشِ احوال واقعی" ہو چکی۔ اب شہنشاہی حرم کے دوسرے "محرمِ راز"، مانکی کے باخبر دماغ کا تجزیہ بھی خود اس کے بیان کردہ عجائبات کی روشنی میں کر لینا ضروری ہے۔ لاف وگزاف، شیخی، نفرت، سریع الاعتقادی، ذہنی رعونت وانانیت، عدم تحقیق اور عامیانہ آوارگیٔ طبع کو اس کی نامور تصنیف میں عام امتیازی رتبہ حاصل ہے۔ ولیم اروِن کہتے ہیں کہ اس نے عالمگیر کی ملازمت قبول کرنے سے صرف اس لئے انکار کر دیا تھا کہ اسے اُس سے سخت نفرت تھی[1]۔ اور شاید اسی وجہ سے اس نے عالمگیر کی عزیز بہن روشن آرا کو اخلاق سوز مطاعن کا ہدف بنانے کی شرمناک کوشش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اور اسی کوشش کو معتبر اور مستند بنانے کے لئے اس نے فنِ طب میں اپنی مزعومہ "لقمانیت" کو شاہی محلسرا میں رسائی اور اپنے رازدانِ حرم ہونے کا بہترین ذریعہ بتلاتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ "خاص خاص بیگمات اور خواجہ سراؤں کو اس سے بڑی عقیدت تھی[2]"۔ حالانکہ روشن آرا بیگم کے متعلق اس کی تمامتر معلومات کا ماخذ صرف ایک پرتگیز لونڈی تھی، جس کا نام وہ تھومازیا مارٹنس بتلاتا ہے، جس سے اسے محبت تھی، وہ لکھتا ہے کہ:-

"بوجہ اس محبت کے جو اسے (یعنی تھومازیا مارٹنس کو) میرے ساتھ تھی ...... اندرون محلسرا کے تمام واقعات سے مجھے مطلع کرتی رہتی تھی[3]"۔

اور اس کے بیانات پر ایمان لاتے ہوئے اُس نے تمام اُن فرضی نصائح کو جو اورنگ زیب نے روشن آرا بیگم کو قلعہ سے باہر سکونت اختیار کرنے کے موہوم ارادہ سے باز رکھنے کے لئے کی تھیں، نقل کر دیا ہے اور اس سے نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ روشن آرا بیگم بدکردار تھی اور اسی لئے اُس کی تمام نقل وحرکت پر سختی سے نگہداشت کی جاتی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دفعہ بیگم کی سکونت گاہ پر بہت مضبوط پہرا بیٹھانے کی ضرورت بھی لاحق ہوئی تھی، کیونکہ

"اطلاع موصول ہوئی تھی کہ دو آدمی وہاں داخل ہوگئے تھے[4]"

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ:-

"وہاں روشن آرا بیگم نے اپنی تفریح کے لئے نو نفر جوانانِ رعنا کو خفیہ طور پر رکھ چھوڑا تھا۔ فخر النسا بیگم، اورنگ زیب کی بیٹی نے اپنی پھوپھی سے درخواست کی کہ ان میں سے کم از کم ایک ہی جوان اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ روشن آرا

[1] اروِن کا دیباچہ اسٹوریا۔ [2] اسٹوریا جلد اول صفحہ ۲۲۔ [3] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۳۵۔ [4] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۲۵

نے اپنی بھتیجی کی درخواست کو نامنظور کردیا تو اس نے اپنے باپ سے سارا حال کہدیا چنانچہ اورنگ زیب نے ان نوجوانوں کو بھی ہلاک کرادیا اور زہر دیکر روشن آرا کی بھی زندگی ختم کردی"۔

اب آیئے "اسٹوریا" کے اس بیان کو تنقید صحیح کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے جانچ لیں تاکہ قارئین پر بخوبی واضح ہوجائے کہ مغربی مورخین کو اسلامی تاریخ ہند لکھنے میں کن ماخذوں سے بالعموم واسطہ پڑتا ہے۔

مانکی جنوری ۱۶۵۶ء میں پہلی بار بندرگاہ سورت پر اترا اور اسوقت سے ۱۶۶۲ء تک اس کی حالت ایک پریشان حال پناہ گزیں کی سی تھی۔ دارا کی فوج میں وہ بحیثیت ایک توپچی کے ملازم ہوا اور ۱۶۵۸ء میں معرکۂ ساموگڑھ میں شریک رہا، اس کے بعد اس نے اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کرلی اور کچھ عرصہ بعد وہاں سے فرار ہوکر لاہور کی راہ لی اور دارا سے جاملا۔ وہاں سے وہ ملتان اور ملتان سے بھکر گیا، جہاں اس کو بسنت نامی ایک خواجہ سرا کے ماتحت جو وہاں کا کمان افسر تھا توپ خانہ میں رکھا گیا۔ دارا کی شکست کے بعد وہ لاہور واپس آیا اور وہاں سے بعض اور یوروپین توپچیوں کے ہمراہ دہلی آیا۔ ۸ دسمبر ۱۶۶۲ء کو اس نے اورنگ زیب کو کشمیر کی جانب روانہ ہوتے دیکھا اور پھر پٹنہ ہوتے ہوئے ڈھاکہ اور راج محل گیا جہاں سے سند نبسی کی راہ سے ہگلی پہونچا۔ اس کے بعد غالباً ۱۶۶۳ء میں قاسم بازار سے ہوتے ہوئے آگرہ پہونچا اور طبابت کا پیشہ اختیار کرلیا یہاں کنور کرت سنگھ کی معرفت راجہ جے سنگھ سے اس کا تعارف ہوگیا اور دس روپیہ یومیہ پر فوج میں کپتان بنا دیا گیا پھر ۱۶۶۴ء میں راجہ جے سنگھ کے ہمراہ دکن گیا اور جولائی ۱۶۶۹ء میں مستعفی ہونے کے بعد براہ کلیانی اور لبسبین مئی ۱۶۶۷ء میں گوا پہونچا، جہاں سے آگرہ اور دہلی کو اگست ۱۶۶۸ء میں واپس آیا اور کرت سنگھ کے رسالہ میں ۵ روپیہ یومیہ پر ملازم ہوگیا جب ۱۶۶۹ء میں کرت سنگھ کابل گیا تو مانکی لاہور میں رہ گیا اور یہاں ۱۶۷۶ء تک طبابت کرتا رہا اور اسی سال یوروپین نوآبادیات میں مستقل سکونت کا ارادہ کرلینے کے بعد دمن دمن روانہ ہوگیا۔ مگر پھر ۳۰ جنوری ۱۶۷۸ء کے بعد دہلی واپس آیا اور اس مرتبہ ولی عہد سلطنت شاہ عالم کا طبیب مقرر ہوا اور اس کے ہمراہ ۶ ستمبر ۱۶۷۹ء کو اورنگ آباد چلا گیا۔ پھر کبھی وہ آگرہ یا دہلی واپس نہیں آیا۔[1]

پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک ۱ر کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوسکتا ہے اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔ — منیجر نگار

مذکورہ بالا واقعات سے یہ قطعی طور پر واضح ہوگیا کہ شاہجہاں کی وفات کے وقت (۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء)

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ارون کا دیباچہ اسٹوریا۔

مانکی دہلی یا آگرہ میں موجود ہی نہ تھا اور سنہ ۱۶۵۶ء سے سنہ ۱۶۶۸ء تک اس کی کوئی خدمت حرم شاہی کے کسی شعبہ سے متعلق نہ تھی۔ اس لئے اس عرصہ میں اندرون حرم کے کسی واقعہ کی بابت اس کا کوئی بیان قابل تسلیم نہیں ہو سکتا یہ بھی ظاہر ہے کہ روشن آرا بیگم کے انتقال کے وقت (۲۰ ستمبر سنہ ۱۶۷۱ء) وہ آگرہ یا دہلی میں موجود نہ تھا بلکہ وہ ۳۰ جنوری سنہ ۱۶۷۸ء کے بعد دہلی واپس ہوا تھا۔

مانکی نے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا اورنگ زیب کی ایک بیٹی کا نام فخر النساء بیگم بھی بتلایا ہے جس نے بقول اس کے روشن آرا بیگم کو اس کی "عیاشی" کے حالات فاش کر کے زہر سے ہلاک کروا دیا تھا یہ مورخ چونکہ عالمگیر کا ہمعصر ہونے کے علاوہ شاہ عالم کا طبیب اور یوروپین بھی تھا اس لئے غیر ملکی اور غیر مسلم مورخین کے نزدیک اسے اعتبار کا مخصوص رتبہ حاصل ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ہم خود اسی کی زبانی اورنگ زیب کی اولاد کے حالات معلوم کریں۔ وہ کہتا ہے کہ "زیبت نکسا بیگوم" (زیب النساء بیگم) سلطان محمد اور سلطان معظم کی سگی بہن اور ایک راجپوت ماں کی بیٹی تھی اور شہنشاہ کی دوسری بیٹیاں "زینت نکسا بیگوم" (زینت النساء بیگم) اور "بڈرکسا بیگوم" (بدر النساء بیگم) سلطان اعظم اور سلطان اکبر کی سگی بہنیں تھیں اور ان کی ماں "کسا نواس کان" (شاہ نواز خاں) نامی ایک ایرانی امیر کبیر کی بیٹی تھی۔ ان دونوں لڑکیوں کی شادی مراد بخش اور دارا شکوہ کے لڑکوں سے ہوئی تھی "فکرو نکسا بیگوم" نے "جو ایک دوسری خاص بیوی سے تھی" ساری عمر شادی نہیں کی۔[1]

مگر اس کا یہ بیان واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ اورنگ زیب کی ایک بیوی دلرس بانو بیگم بنت شاہ نواز خاں کے بطن سے زیب النساء بیگم، زینت النساء بیگم، زبدۃ النساء بیگم، سلطان اعظم اور سلطان اکبر تھے۔ ان میں سے اول الذکر دونوں شہزادیوں نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ شہنشاہ کی دوسری بیوی نواب بائی نادر الزمانی تھی جو کاشمیر کے راجہ کی لڑکی تھی۔ اس کے بطن سے سلطان محمد، سلطان معظم، بدر النساء بیگم اور مہر النساء بیگم پیدا ہوئے۔ مہر النساء کی شادی سلطان مراد بخش کے لڑکے ایزد بخش سے ہوئی تھی اور بدر النساء ساری عمر دوشیزہ رہی۔

شہنشاہ کے اودیپوری محل سے صرف کام بخش پیدا ہوا تھا۔ مانکی جو حرم شاہی کے متعلق اپنی معلومات کو بالکل یقینی ظاہر کرتا ہے۔ اورنگ زیب کی اولاد میں زبدۃ النساء، مہر النساء اور کام بخش کا نام تک نہیں لیتا!!

اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم کر لیں کہ شاید صوتی مشابہت کی وجہ سے مانکی کو بدر النساء، مہر النساء اور فخر النساء میں امتیاز کرنا دشوار ہوا ہو گا تب بھی اس کے ادعائے فارسی دانی سے قطع نظر کرتے ہوئے، فخر النساء کا (جس نے بقول اس کے ساری عمر شادی نہیں کی تھی) بدر النساء سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ خود کہتا ہے کہ

---

[1] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۵۸-۵۷-

"بڈر کسا بیگوم" کی شادی مراد بخش کے لڑکے سے ہوئی تھی، جو واقعہ کے خلاف ہے۔ زبدۃ النسا (جس کا بہت طویل عمر پانے کے باوجود بھی اس نے کوئی ذکر نہیں کیا) اور فخر النسا، میں صوتی اعتبار سے کوئی مشابہت اور مناسبت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے صرف مہر النسا ہی کو وہ فخر النسا کہہ سکتا تھا۔ مگر مہر النسا، کی شادی مراد بخش کے لڑکے ایزد بخش سے گیارہ سال، دو ماہ اور نو دن کی عمر میں ہو چکی تھی اور اس کمسنی میں اس کا اپنی پھوپھی کی "عیاشی" سے دلچسپی رکھنا عجیب بات ہے۔ علاوہ اس کے تاریخ کی اس ناقابلِ تردید صداقت کا انکار کیونکر کیا جا سکے گا کہ مہر النسا، کی شادی روشن آرا بیگم کی وفات کے کامل ایک سال اور ایک ماہ بعد ۲۷ نومبر ۱۶۷۲ء کو ہوئی تھی !!!

شہنشاہی حرم سرا سے "تقرب" کی بنا پر مانگی نے جہاں تاریخ ہند پر اپنے مخصوص مشاہدات و تجربات کی اتنی کچھ "نور" افشانی کی ہے وہاں اس نے حرم کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے سال و ماہ کا تعین تو کیا اشارہ تک نہیں کیا۔

تاہم اگر "فکر ونکسا بیگوم" کے ایماء پر اورنگ زیب نے اپنی عزیز ترین محسنہ اور ہمشیرہ کو زہر سے ہلاک کرا دیا تھا تو ایسا کرنے سے کم از کم ایک ہفتہ قبل اسے تمام اسباب کا علم ہو جانا لازمی تھا، کیونکہ ایک ایسا شاہنشاہ جو مذہبی تعصب اور پابندیٔ شرع کی خاطر اس حد تک بدنام ہو کہ بقول سر جادو ناتھ سرکار "اسے کسی نوع کے مادی نقصان کا خوف یا کسی عزیز کا اثر..... شریعت کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا" خود اپنی اولاد بہن کا کام تمام کرنے میں تاخیر سے کیوں کام لیتا؟ بڑی تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ مانگی کے خبر رساں ذرائع نے اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دیا کہ روشن آرا بیگم کی وفات ۵۶ سال کی عمر میں ہوئی جبکہ بلاشبہ شباب کے ہیجانی جذبات کا بہت کچھ خاتمہ ہو چکتا ہے !!

اگر محض بحث کی خاطر مانگی کی کذب بیانی سے قطع نظر "فکر ونکسا" اور "بڈر کسا" کو ایک سمجھ بھی لیا جائے تب بھی تاریخی حقایق و واقعات مذکورۂ بالا الزامات کی پرزور تردید کریں گے۔ اگر اورنگ زیب کے زمانہ کی مذہبی فضا میں شریف مسلمان خاندانوں کی تہذیب و شایستگی، آداب و اخلاق، اور اعلیٰ طبقہ کی مسلم خواتین کی اخلاقی اور مذہبی تربیت و تعلیم کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی کیا مانگی کو یہ نہ جاننا چاہئے تھا کہ بدر النسا بیگم، حسن سیرت و صورت کی ایک کمیاب مثال تھی۔ اس کی طبیعت فطرتاً مذہب کی طرف مایل تھی، وہ حافظۂ قرآن تھی اور محاسن اخلاق اور شرافتِ اطوار کی ایک مضبوط چٹان تھی اور ابھی یہ کلی پھول کی طرح کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ دستِ اجل کے پنجہ نے اسے باغ ہستی سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا !! اس کی وفات روشن آرا بیگم کی تاریخ وفات سے ایک سال ۵ ماہ قبل واقع ہو چکی تھی !! پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بدر النسا بیگم اپنی پھوپھی کو ہلاک کرا دینے کے بعد یہ عجیب کہانی سنانے کے لئے کیسے زندہ رہ گئی !!!

اس تنقید و تبصرہ کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کی مروجہ درسی کتب تواریخ کے تیار کردہ نوادر کے باوجود کہ اورنگ زیب نے سنہ ۱۱ جلوس (۱۶۶۸ء - ۱۶۶۹ء) میں "ایک احمقانہ حکم"[1] کے ذریعہ تاریخ نویسی کو ممنوع قرار دیدیا تھا، یہ یاد رکھنا غیر مفید نہ ہوگا کہ اس امتناعی حکم سے صرف سرکاری محکمۂ تاریخ نویسی کا بند کر دینا مقصود تھا نہ کہ عام طور پر تاریخ نویسی کی ہر انفرادی سعی و کوشش جرم قرار دیدی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود سنہ ۱۱ جلوس کے بعد کی لکھی ہوئی تاریخیں آج بھی بکثرت موجود ہیں۔ اگر امیر خاں کی "واقعات عالمگیری" ملا محمد کی "تنقیحات الاخبار" "عالمگیر نامہ" اور دیگر مستند کتابیں مسلمانوں کی تصنیفات ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول بھی خیال کر لی جائیں تب بھی یوروپین سیاحوں کے بیانات کو، ہندو مورخین کے مقابلہ میں جو اورنگ زیب کے ہمعصر ہونے کے علاوہ اپنے مسلمان ہموطنوں کے تمدن، معاشرت، تہذیب و اخلاق اور رسم و رواج سے بہت بڑے واقف کار تھے، سنجیدہ تاریخ داں یقین کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

ہندو مصنفین کی تاریخی تصنیفات کی فہرست درج ذیل کی جاتی ہے:-

(۱) فتوحات عالمگیری، مصنفہ ایشر داس ناگر سنہ ۹۲-۱۶۹۳ء کے حالات کی تفصیل ہے۔

(۲) نسخۂ دلکشا، از بھیم سین ولد رگھو نندن داس، شاہ عالم کی تخت نشینی تک کے حالات پر مشتمل ہے[2]۔

(۳) منتخب التواریخ مصنفہ جگ جیون داس ولد منوہر داس، یہ کتاب برٹش میوزیم میں ہے اور سنہ ۱۷۰۹ء میں مکمل ہوئی تھی۔

(۴) لب التواریخ ہند، مصنفہ رائے بندرابن ولد رائے باہر امل، یہ تاریخ عالمگیر کے نام معنون ہے اور اسکا اصل نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔

(۵) خلاصۃ التواریخ، مصنفہ سنجان رائے (سبحان رائے یا سجان رائے ؟؟) عالمگیر کی عہد حکومت کے چالیسویں سال تک کی تاریخ ہے عالمگیر کے عہد میں اس کی تکمیل ہوئی اور اُسی کے نام معنون کی گئی[3]

سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ ان مستند کتب تاریخ میں کسی ایک سے بھی مانچی اور برنیئر کی بیان کردہ حکایات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ خود سرسرکار مانچی کی مذکورۂ بالا روایات کو بازاری گپوں اور اس کی سریع الاعتقادی پر محمول کرتے ہوئے مآثر عالمگیری صفحہ ۱۱ کے حوالہ سے روشن آرا بیگم کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اس میں شریفانہ اوصاف اور قابل ستائش خصوصیات پائی جاتی تھیں اور اسے اپنے بھائی سے بڑی محبت تھی۔ عالمگیر نے اس کی وفات پر ایصال ثواب کے لئے بڑی رقمیں خیرات کیں اور اس کے زیر دستوں اور ملازموں پر عنایات صرف کیں"[4]

---

[1] ونسنٹ اسمتھ کی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا جلد دوم صفحہ ۴۳۶۔ [2] سرسرکار کو ایشر داس اور بھیم سین کے علاوہ دیگر مورخین کا علم نہیں!! وہ انہیں دو کا حوالہ دیتے ہیں۔ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے معارف (اعظم گڈھ) نمبر ۵ جلد ۲۹ صفحہ ۳۳۵ بابت مئی ۱۹۳۲ء۔ [4] سرکار تاریخ اورنگ زیب جلد سوم صفحہ ۶۰۔

کیا عالمگیر ایک بدکردار بہن کے لئے یہ سب کچھ کرسکتا تھا؟

الغرض اسی قماش کی بازاری گپوں اور فرضی افسانوں کی صدہا مثالیں برنیر اور مانکی کے صفحات میں ہمیں جابجا ملیں گی اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مصنف اُن پر بلا چون وچرا اعتماد کرنے کے بعد معقول پسند حلقوں میں کبھی بھی عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ یہی نہیں کہ "اسٹوریا" مانکی کی ذہنی پستی کی مکمل آئینہ دار ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی بقول پروفیسر اسٹینلی لین پول :-

"غلطیوں سے بھری پڑی ہے اور اخبار الفواحش کی گندگیوں سے آلودہ ہے اور ایک حاسد، نامراد اور سفلہ خدمتگار کی ذہنی پیداوار ہے[1]"

باوجود ان تمام کمزوریوں کے دونوں یوروپین سیاحوں کے بیانات باشندگانِ ہند کے عام حالات، تجارت، حرفت کی کیفیات اور مسیحی کلیساؤں کے متعلق خاص توجہ کے مستحق ہیں، مگر ان کے علاوہ بجز اُن کے ذاتی مشاہدہ میں آئے ہوئے واقعات کے اُن کی تمامتر معلومات یا تو وہمی وقیاسی ہیں یا محض بازاری گپوں پر ان کا دارومدار ہے۔ اس لئے دیگر معتبر تاریخی شہادتوں اور فارسی خطوط کے مقابلہ میں اُن کی کوئی وقعت[2] نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہجہاں کے عہد سے پہلے کے واقعات کو مانکی نے ایک مضحکہ انگیز چیستان بنا دیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں ستی کے رواج کی ابتدا شہر دہلی کے بانی "کنگ بکرماجید" کے زمانہ میں اس لئے ہوئی تھی کہ "راجپوت عورتیں اپنے شوہروں کو قتل کر دیا کرتی تھیں[3]" اور اپنے "واقفِ حالات" ہونے کی بنا پر وہ اپنے قارئین کو یہ بتلا کر محوِ حیرت کر دیتا ہے کہ جے ل، چتوڑ کا راجہ تھا اور اکبر بادشاہ[4] نے پدمنی کی خاطر جو کہ "اُس[5] کی بہت سی پری جمال بیویوں میں سے ایک تھی" چتوڑ پر حملہ کیا تھا[6]۔ وہ ہمیں مطلع کرتا ہے کہ اکبر ایران میں پیدا ہوا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ آگرہ کو تانبہ کا بنا دے[7] اس کے نزدیک اوزان اور آلات پیمائش اور گز وغیرہ ہندوستان میں سب سے پہلے "شیرا" یا شیر شاہ نے جاری کئے تھے[8]۔ عہد اکبر شاہی کے مشہور جیسوٹ سیاح فادر مانسریٹ کی طرح جس نے قبل از اسلام ہندوستان کے مسیحی بادشاہوں کی یادگار "جنھیں ہمارے اسلاف واجداد انڈین پریسبٹر جانس کہا کرتے تھے" اور جنھیں مسلمانوں نے اس طرح برباد کر دیا کہ اب مسیحیت کی یاد بھی لوگوں کے دماغوں سے کافور ہو گئی[9]"۔ اپنی نامور تصنیف کامنٹری میں چھوڑی تھی۔ مانکی بھی ہمیں ایک "جہاندیدہ" سیاح کی حیثیت سے گرمجوشی سے یقین دلانا چاہتا ہے کہ "زمانہ قدیم میں ہندوستان میں چینیوں کی حکومت تھی اور آجتک انکی عمارات کے آثار الورہ، سالسٹ اور دہلی میں[10] دیکھے جاسکتے ہیں"۔ یہ ہیں معلومات اُس شخص کی جو کہتا ہے کہ :-

"بہت سے مصنفین سنی سنائی باتوں کو بلا تحقیق لکھ دیا کرتے ہیں"

محمد یعقوب (بی۔اے۔ایل بی) چھاؤنی مئو

[1] اورنگ زیب از لین پول رولرز آف انڈیا سیریز ۱۸۹۳ء [2] سر سرکار، دیباچہ تاریخ اورنگ زیب جلد اول صفحہ ۱۷، ۱۵ [3] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۱۳۰ [4] صفحہ ۱۳۰ - ۱۳۳ [5] صفحہ ۱۲۰ [6] صفحہ ۱۳۹ [7] صفحہ ۱۱۶ [8] کامنٹری از مانسریٹ مترجمہ ایس ہائی لینڈ [9] اسٹوریا جلد دوم صفحہ ۱۱۵

مکتوبات نیاز

قبلۂ محترم - بڑی مشکل آ پڑتی ہے جب کسی سے دل کی بات چھپائے نہ بنے اور وہ پوچھ بیٹھے۔ آپ کا وجود تو میرے لئے "دیوارِ حرم" ہے کہ کہیں پناہ نہ ملے تو آخر کار وہیں جا کر سر چھپانا ہے، لیکن ابھی تو تیرے بدل بدل کر وار خالی دے رہا ہوں اور خیال ہے کہ یونہی لڑتا بھڑتا نکل جاؤں گا، پھر آپ کیوں اس قدر فکر مند ہیں۔

رہا اصل معاملہ، سو بقول داغ

اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

یعنی وہ خدا کا معاملہ "فردا" پر اُٹھا رکھتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ خدا نام ہے صرف "آج" کا بلکہ اُس لمحہ کا جو اِس وقت گزر رہا ہے، کیونکہ فردا عدم محض ہے اور اس کا وجود "آج" ہی کی صورت میں متحقق ہو سکتا ہے

میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا فیصلہ اس باب میں کیا ہوگا، لیکن جو کچھ بھی ہو مجھے تو اسی دنیا میں جان دینا ہے اور پھر اُٹھنا نہیں، جنھیں حشر و نشر کا سوقیانہ ہنگامہ گوارا ہو وہ اس کی تمنا کریں، حوروں کی آرزو کیا کروں، جانتا ہوں کہ من و سلویٰ کھانے والے بھی لہسن پیاز پر اُتر آئے تھے، سونے چاندی کے مکان وہاں ملے بھی تو کس کام کے جبکہ ان کی ایک اینٹ بھی فروخت کر کے یوروپ جانے کے لئے ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ رزرو نہیں کرا سکتا، رہ گئے پھل سو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہاں یونہی نزلہ کا زور رہتا ہے، چہ جائیکہ اس پر پھلوں کی بھرمار جو سریع الاستحالہ ہونے کی وجہ سے فوراً خلط غالب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ فردوس کا ٹمپریچر کیا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں ہر وقت صبح صادق کا سا سماں نظر آئے گا۔ لیکن کس موسم کی صبح صادق اور کس ملک کا موسم؟ - اگر سرزمین عرب کو معیار قرار دیا جائے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کے کس موسم کی صبح صادق ایسی ہو سکتی ہے جو دنیا کے ہر شخص کے لئے موزوں ہو۔

قطب شمالی کی بسنے والی قوم (اسکیمو) کے سامنے آپ جہنم کی بڑھتی ہوئی گرمی کا ذکر کریں گے تو وہ قصداً گناہ کر کے وہیں جائے گی اور، اگر فردوس کے موسم میں بڑا اعتدال پیدا کر کے آپ اُسے شرقی کے لکھنوی انگرکھے تک کھینچ لائیے، تو سویڈن یا ناروے کے جنتی کے لئے وہ دوزخ سے بھی بدتر ہوگا۔

خدا کو اگر جنت و دوزخ بنانا ہوتی تو ساری دنیا کا موسم اور سب کا ذوق بھی ایک ہی رکھتا۔ پھر اگر یہ نہیں ہو تو وہ بھی نہیں۔ انھیں دشواریوں کو دیکھ کر مولوی کہتے ہیں کہ جنت میں سب ایک عمر، ایک ذوق اور ایک رجحان کے ہوں گے صورت غالباً اس لئے ایک نہیں بتائی کہ حوروں کو دھوکا ہو جاتا۔ بہرحال حشر و نشر کے عقیدہ کے ساتھ یہ طومار بندی میرے بس کی چیز نہیں، میں تو مرکے خدا کو کسی جھگڑے میں ڈالنا پسند نہیں کرتا، وہ اگر حشر و نشر نہ کرے بھی خدا رہ سکتا ہے تو پھر ہم کیوں اسے اُلجھن میں مبتلا کریں۔

آپ ہنسئے نہیں، ذرا غور کرکے بتائیے کہ یہ ہے کیا؟

جی ہاں، کل وہ بھی دیکھ لیا، جس کے دیکھنے کی آرزو تو ہے، لیکن ہمت نہیں۔

بلا باشد، دو شاہد را بہ بحث ناز پیچیدن
نگہ در نکتہ زائیہا، نفس در سرمہ سائیہا!

پہلے مصرعہ میں "چہ خوش باشد" کی جگہ "بلا باشد" میرا تصرف ہے، جو میرے تاثر کے لحاظ سے ضروری تھا یوں تو ساری صحبت قیامت تھی، لیکن وہ وقت نہیں بھولتا جب رضی صاحب انتہائی جوش و خروش کے ساتھ آستینیں چڑھا کر کچھ کہنے کے لئے آمادہ ہوئے اور اُدھر سے یہ فقرہ کسا گیا کہ "ہٹ جانا ——— آشفتہ نوائے بہ سرِ دار برآید"

اس میں شک نہیں دونوں بلا ہیں، اور میں اب وہاں نہ جاؤں گا، جب تک "ردِ بلا" کا کوئی عمل ہاتھ نہ آجائے۔ تم تو خیر "نادِ علی" کے زور پر سارا زور سنبھال لیجاتے ہو، لیکن میں کیا کروں جبکہ نہ کوئی "مظہر العجائب" یہاں مدد کو پہونچتا ہے نہ کوئی مستجاب الدعوات!

مکرمی - شاعروں کی نہ کہئے، مرفوع القلم جماعت ہے۔ "رگِ جاں" میں تو دونوں الفاظ غیر متناسب نہیں ہیں، کیونکہ زندگی کا تعلق خون سے ہے جو رگوں میں دوڑتا ہے اور "شہ رگ" آپ جانتے ہی ہیں کہ کتنی اہم چیز ہے۔ لیکن اور رگوں کو کیا کہئے گا جو شعرا نے پیدا کی ہیں، ابر میں رگ کہاں سے آئی لیکن رگِ ابر اس باریک سفید خط کو کہتے ہیں جو سیاہ ابر کے ٹکڑے میں کہیں نظر آجاتا ہے۔ اور تو اور رگِ تلخی ملاحظہ کیجئے، اس سے مراد شراب و گلاب کی تلخی ہے۔ غالب نے بات میں بھی رگ پیدا کر دی ہے۔

لکھتا ہے :-

فرجامِ سخن گوئی غالب بتو گویم،
خونِ جگر ست از رگِ گفتار کشیدن

مغربی لٹریچر کے زیر اثر اُردو کے انداز بیان میں بہت سی باتیں واقعی نہایت عجیب و غریب آ گئی ہیں، لیکن آپ ان کو محض اس بنا پر غلط نہیں کہہ سکتے کہ اساتذۂ سلف کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ زبان یونہی ترقی کرتی آئی ہے، اس پر ناک بھوں چڑھانا غلطی ہے۔ آپ اس سیلاب میں نہ پڑئے، لیکن اس کے روکنے کی کوشش بھی نہ کیجئے، نتیجہ معلوم!

چند قابل مطالعہ کتابیں

کسان:۔ مصنفہ چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم، ایل اے، ایم، ایل سی مترجمہ مولوی محمود علی خانصاحب (جامعی) قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی، پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسے خوش حالی سے محتاج بنایا گیا! اور اس حالت کو پہونچا دیا کہ تن ڈھانکنے کو کپڑا اور دو وقت کھانے کو روٹی بھی نہیں! اس کتاب میں ان امور پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس مصیبت کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔ ۳۷۵ صفحات قیمت مجلد عہ

مضامین محمد علی:۔ مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں، زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ مجلد ۶؎

مضامین رشید:۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے نچی ہوئی کشت زعفران، تر و تازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۶؎

میدان عمل:۔ ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ۶؎

بیوہ:۔ منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ عہ

فکر و نشاط:۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی پر جوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب سید محمد مہدی صاحب۔ کانپور)

اس سے پہلے نگار کی بعض اشاعتوں میں مومن کے چند مشکل اشعار کا حل بعض استفسارات کے جواب میں آپنے شایع کیا تھا، لیکن بعد کو وہ سلسلہ بند ہوگیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نگار میں یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری رکھا جائے تاکہ آخر میں ایک کتاب کی صورت ہوجائے۔ ذیل کے اشعار کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ فرصت ہو تو توجہ فرمائیے :۔

۱۔ پھر زیب سر ہے شعلۂ داغِ جنوں سے کج   پھر دور باش نالہ اثر اہتمام ہے

دوسرا مصرعہ بہت الجھا ہوا، سمجھ میں نہیں آتا۔

۲۔ داغ سے میرے جہنم کی مثال   تو بھی واعظ دل جلانا چھوڑ دے

لفظ مثال نحوی ترکیب سے کس فعل سے تعلق رکھتا ہے۔

۳۔ بیوفائی کا عدو کی ہے گلہ   لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

جب معشوق عدو کی شکایت کرتا ہے تو اس میں عاشق کے ستائے جانے کی کیا بات ہے۔

۴۔ حیرت حسن سے یہ شکل بنی   کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

آئینہ دکھانے سے کیا مراد ہے، کہیں اس سے یہ مدعا تو نہیں کہ میں آئینہ کی طرح حیران رہگیا۔

۵۔ وہ جو کہتے ہیں تجھے آگ لگے   مژدۂ وصل سناتے ہیں مجھے

"آگ لگے" سے مژدۂ وصل کا کیا تعلق ہے؟

۶۔ کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس   سب کاوش رقیب بجا کوہکن سے ہے

۷- ان کو گمان ہے گلۂ چین زلف کا، خوشبو دہانِ زخم جو مشکِ ختن سے ہے

۸- میں کیا کہ مرگِ غیر پہ داماں تر نہ ہو وہ اشک ریز خندۂ چاکِ کفن سے ہے

۹- رشک پری کہے سے عدو کی یہ وحشتیں نفرت بلا تمھیں مرے دیوانہ پن سے ہے

۱۰- داغِ جنوں کو دیتے ہیں گل سے زبس مثال میں کیا کہ عندلیب کو وحشت چمن سے ہے

۱۱- کیوں یار نوحہ زن ہیں کہاں مرگ مجھ کو تو لب بستگی تصور بوسِ دہن سے ہے

۱۲- وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

(نگار) یقیناً یہ سلسلہ مفید ہے، اور کلام مومن کی شرح، کلام غالب سے زیادہ اہم چیز ہے، لیکن بہر حیثیت ایک مستقل موضوع کی صورت سے اس پر بحث کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ لیکن استفسارات کے سلسلہ میں بیشک کبھی کبھی کچھ لکھ سکتا ہوں۔ مطالعہ کے دوران میں آپ کو جو اشعار مشکل نظر آئیں وقتاً فوقتاً انھیں میرے پاس بھیجتے رہئے تعمیل ارشاد کی کوشش کروں گا

۱- پہلے مصرعہ کا آخری لفظ عشق نہیں، تاج ہے۔ آپ کو صحیح یاد نہیں رہا۔ دوسرے مصرعہ کو یوں پڑھئے:۔

پھر دورباشِ نالہ، اثر اہتمام ہے

"اثر اہتمام" یعنی اثر کا اہتمام کرنے والا، اثر پیدا کرنے والا۔ دورباش سے مراد وہ عصا ہے جسے نقیب آگے آگے لیکر چلتے ہیں۔ نالہ کو دورباش کہنے کی وجہ ظاہر ہے۔

پہلے مصرعہ میں اپنے آپ کو "تاجدارِ عشق" کہکر نالہ کو نقیب بتایا، مطلب یہ ہوا کہ میرے سر پر پھر عشق کا جنون سوار ہے اور نالہ اہتمام اثر میں مصروف ہے

۲- پہلے مصرعہ کو تعجب کے لہجہ میں پڑھئے تو مطلب واضح ہو جائے گا۔ یعنی میرے داغِ دل کو جہنم سے مثال دیتا ہے! اے واعظ تو کیوں دل جلاتا ہے۔

۳- وہ عدو کی بیوفائی کا گلہ کرتے ہیں اور بظاہر ان کا مجھ پر یہ لطف و کرم ہے لیکن حقیقتاً وہ مجھے اور ستانا چاہتے ہیں، کیونکہ میں تو عدو کا ذکر ان سے کسی طرح سننا ہی نہیں چاہتا، خاص کر گلہ و شکایت کی صورت میں کہ اس سے تو اور لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔

۴- اس کا حسن دیکھ کر سکتہ کا سا عالم طاری ہو گیا اور وہ مجھے آئینہ دکھانے لگے، سکتہ کے مریض کے پاس آئینہ لیجا کر دیکھتے ہیں کہ مر تو نہیں گیا۔ اگر آئینہ میں کچھ نم پیدا ہو جاتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ سانس آرہی ہے، ورنہ مردہ تصور کر لیا جاتا ہے۔

۵ ۔ مژدۂ وصل سے زیادہ آگ لگانے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔

۶ ۔ اس شعر میں قیس، شیریں اور خسرو کی تلمیح ہے۔ کہتا ہے کہ اگر خسرو اپنے رقیب قیس سے کاوش رکھتا ہو تو نادرست نہیں، کیونکہ اس نے پتھر کاٹ کر نہر نکالی اور شیریں کی سنگین دلی کا مطلق لحاظ نہ کیا۔ یعنی اگر اسے شیریں سے محبت ہوتی تو وہ اس کی سنگیں دلی کے احترام میں پتھر نہ کاٹتا۔

۷ ۔ زخم میں مشک بھرنے سے تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے تو زخم میں مشک بھرا تھا، کیونکہ مجھے یہ تکلیف پسند ہے، لیکن اس کی خوشبو کو دیکھ کر محبوب یہ سمجھا کہ شاید اس نے دہانِ زخم سے اس کی چینِ زلف کا شکوہ کیا تھا اور یہ خوشبو اسی وجہ سے پیدا ہوئی۔

۸ ۔ میرے مرنے پر اگر وہ اشک ریز ہے تو اس کا سبب یہ نہیں کہ مجھ سے محبت تھی، کیونکہ وہ تو ایسا ظالم ہے کہ میں کیا، رقیب کی موت پر بھی آنسو بہانے والا نہیں، بلکہ سبب یہ ہے کہ وہ میرے چاک کفن کا ہنسنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

۹ ۔ میرے دیوانہ پن سے تمہیں اس بلا کی نفرت ہے کہ عدو نے تمہیں پری کہدیا تو خفا ہو گئے۔ مدعا یہ کہ میرے دیوانہ پن سے وہ کوئی نسبت گوارا نہیں کرتے، یہاں تک کہ میں دیوانہ ہوں تو انھیں کوئی پری بھی نہیں کہہ سکتا۔ مشہور ہے کہ پری کا سایہ پڑنے سے انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔

۱۰ ۔ میری وحشت کا یہ عالم ہے کہ میرے داغِ جنوں کو پھول سے تشبیہ دینے لگے تو بلبل کو بھی چمن سے وحشت پیدا ہونے لگی۔

۱۱ ۔ "مجھ کو تو" کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے۔ دوست احباب کیوں روتے ہیں، مجھے موت کہاں آتی ہے۔ میرے ہونٹ موت کی وجہ سے بند نہیں ہوئے بلکہ بوسۂ دہانِ یار کے تصور میں بند ہوئے ہیں۔

۱۲ ۔ اگر تم کو دشمن سے اس لئے دوستی ہے کہ وہ میرا بدخواہ ہے تو غلطی کرتے ہو کیونکہ جتنا میں خود اپنا بدخواہ ہوں وہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر تم کسی سے صرف اس لئے دوستی کر سکتے ہو کہ وہ میرا بدخواہ ہے، تو مجھ سے کرو کہ مجھ سے زیادہ میرا کوئی بدخواہ نہیں (اور وہ اس طرح کہ تم کو چاہتا ہوں)

علامۂ مشرقی اور قبلہ کا رُخ

(جناب محمد سعید الرحمان صاحب۔ لاہور)

آپ نے غالباً علامۂ مشرقی کا پمفلٹ نمبر ۹ دیکھا ہوگا، جس میں انھوں نے ملک محمد الدین صاحب کے ایک

استفسار کا جواب دیتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کی تمام نئی مسجدوں کا قبلہ غلط ہے۔ یعنی مسجدوں کا رُخ صحیح نہیں ہے۔ لاہور و امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس ہے، راولپنڈی والوں کا بغداد و دمشق، پشاور والوں کا بیروت، دہلی والوں کا بوشہر، ملتان کا کوفہ، کراچی والوں کا مدینہ، مدراس والوں کا عدن، بمبئی والوں کا بندرگاہ سواکن وغیرہ۔

اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پچھلی کئی قرنوں کی نمازیں قبلہ کی طرف ادا نہیں ہوئیں، اس لئے قبول نہیں ہوئیں اور یہ مولویوں کا اتنا بڑا جہل ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال کی تلوار ہندوستان میں ہوتی تو وہ ہندوستان کے تمام ملاؤں کو تہ تیغ کر دیتی۔

آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟

(نگار) یہ پمفلٹ میری نگاہ سے گزرا ہے، اور اس کو دیکھنے کے بعد میرے شبہات علامۂ مشرقی کی طرف سے اور زیادہ بڑھ گئے ہیں پچھلے مہینے کے نگار میں آپ نے میری رائے خاکسار تحریک کے متعلق دیکھی ہوگی اور اب اس پمفلٹ کے مطالعہ کے بعد میں اُس پر اور زیادہ راسخ و مستحکم ہو گیا ہوں۔

خاکسار تحریک کے آغاز سے بہت پہلے علامۂ مشرقی سے میرا غائبانہ تعارف اِن کی مشہور کتاب "تذکرہ" کے ذریعہ سے ہوا تھا اور میں نے ان کو ایک آزاد خیال شخص سمجھ کر اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے، بعض مسایل میں انکی تائید بھی کی تھی، اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا اور مجھے نہیں معلوم کہ مصنف تذکرہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے، یہاں تک کہ دفعتًا ان کی طرف سے خاکسار تحریک کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ میرے گوشۂ تنہائی میں بھی اس کی آواز پہونچی اور میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس تحریک کی غایت کیا ہو سکتی ہے اور جس نتیجہ پر پہونچا وہ آپ کو معلوم ہی ہو چکی ہے۔

جس وقت میں دیکھتا ہوں کہ پمفلٹ زیر بحث، تذکرہ کے مصنف کا لکھا ہوا ہے، تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ تذکرہ کا مشرقی ایک ایسا آزاد خیال انسان ہے جو ظاہری قیود شریعت سے بھی بیگانہ نظر آتا ہے اور وہ تمام شعائر اسلامی پر اُن کے مغز و روح کے لحاظ سے گفتگو کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نماز و روزہ کو بھی بیکار سمجھتا ہے اگر اُن سے اجتماعیت و استعلاء پیدا کرنے کا کام نہ لیا جائے۔ برخلاف اس کے پمفلٹ زیر بحث کا مصنف مشرقی ایک ایسا قدامت پرست، تاریک ذہنیت رکھنے والا انسان ہے جو مذہب کے ظواہر پر اتنا زور دیتا ہے کہ اگر کسی مسجد کا رُخ جغرافی و ہیئتی پیمائش کے لحاظ سے ٹھیک کعبہ کی طرف نہ ہو تو وہاں کی نمازیں بیکار ہیں اور اُن کے بنانے والے اس کے نزدیک قتل و قصاص کے مستوجب ہیں۔ یعنی وہی انسان جس نے

کسی وقت " اینما تولوا فثم وجہ اللہ " سے اسلام کے وسیع اصولِ عبادت وطاعت کو پیش کیا ہو آج وہی اتنا تنگ خیال نظر آتا ہے کہ جب تک مسجدوں کا رُخ ٹھیک غلافِ کعبہ کی طرف نہ ہو، نہ نماز ادا ہو سکتی ہے اور نہ ان مسجدوں کا نمازی مسلمان کہلایا جا سکتا ہے۔

بیشک کلام مجید میں " فولوا وجوہکم شطر المسجد الحرام " کا حکم پایا جاتا ہے، لیکن شطر کے معنی " جہت وسمت " کے بھی ہیں اور کسی جہت کی طرف رُخ کرنے کے معنے یہ نہیں ہو اکرتے کہ اُسے ریاضیات کی مدد سے متعین کیا جائے اگر علامۂ مشرقی کے مشورہ کے مطابق ہر مسجد کا رُخ غلاف کعبہ کے ٹھیک درمیانی حصہ کی سمت ہونا چاہئیے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ایک ہی شہر کی ہر مسجد کا رُخ دوسری سے مختلف ہونا چاہئیے، چہ جائیکہ تمام ہندوستان کہ اس صورت میں تو یہ فرق بہت زیادہ نمایاں ہوگا۔

علامۂ مشرقی کو معلوم ہونا چاہئیے کہ کلام مجید نہ ہیئت وجغرافیہ کی کتاب ہے، نہ فلسفہ وریاضی کی۔ اسمیں صرف اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور تمام انھیں آسانیوں کے ساتھ جو عامۃ الناس کے لئے قابل قبول ہوں۔ کلام مجید میں اگر " شطر المسجد الحرام " منھ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ پہلے ہیئت میں کمال حاصل کیا جائے اور پھر عبادت کی جائے، بلکہ مقصود صرف اجتماعیت کی شان پیدا کرنا ہے اور اس غرض کے لئے صرف اس قدر ہدایت کافی تھی کہ کعبہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھو، اگر ہیئت کے نقطۂ نظر سے مسجدوں کا رُخ گز دو گز ادھر اُدھر ہٹتا ہوا ہے تو اس سے اصل مقصود فوت نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اگر یہ کہا جائے کہ شطر المسجد الحرام کی شرط پوری ہو ہی نہیں سکتی جب تک ایک ایک دقیقہ وثانیہ کا حساب کرکے صحیح سمت متعین نہ کیا جائے، تو اس سے اصل مقصود (طاعت وعبادت یا اجتماعیت) ضرور فوت ہو جائے گا، اور رصدگاہیں قایم کرکے صرف ہیئت کا مطالعہ کرنا مدعا رہ جائے گا۔

اگر علامۂ مشرقی کلام مجید کی اس آیت میں اس قدر احتیاط تعمیل ضروری جانتے ہیں تو وہ اُن آیات کی کیا تاویل کریں گے جو طبقات الارض اور ہیئت کے اکثر مسلّمہ مسایل کے خلاف ہیں اور اگر وہ ان آیات کی تاویل کرکے کوئی ایسا مفہوم پیدا کر سکتے ہیں جو علوم جدیدہ کے منافی نہ ہو، تو پھر " شطر المسجد الحرام " والی آیت کے متعلق کیوں اس قدر احتیاط وسختی برتی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک اخلاقی مصلح عوام کو کبھی دماغی اُلجھن میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا، وہ تو نہایت سیدھے سادے الفاظ میں انھیں کے روزانہ مشاہدات وتجربات کی بنا پر اعتبار وبصیرت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہے گا کہ " دیکھو سورج ڈوب رہا ہے " اور یہ کبھی نہ کہے گا کہ " وہ دیکھو زمین کا محدب حصہ ہمارے اور سورج کے درمیان ہو گیا ہے " وہ اگر زمین کو مسطح کہتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ ایسی ہی نظر آتی ہے

اور وہ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ زمین مدور ہے یا غیر مدور اور اگر مدور ہے تو اس کی گولائی گنبد کی طرح ہے یا نانگی کی طرح۔

پھر جب اس قسم کی علمی چھان بین کلام مجید کی تعلیمات سے علیحدہ ہے تو مسجدوں کا رُخ متعین کرنے میں اتنی سختی برتنا کہ اگر ہمارا منھ غلاف کعبہ کی سمت سے ذرا بھی ہٹ گیا تو نماز درست نہ ہوگی، کہاں تک قرین انصاف ہو سکتا ہے۔

دیکھنا صرف یہ ہے کہ جس وقت مسلمان اپنی مسجدوں میں جاکر نمازیں ادا کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں کعبہ کا رُخ ہوتا ہے یا کسی اور جگہ کا۔ اگر ان کے دل و دماغ کی توجہ کعبہ اور مسجد الحرام کی طرف ہوتی ہے تو پھر کوئی حرج نہیں اگر مسجد کی جغرافی سمت کچھ بدلی ہوئی ہے اور اگر انکی توجہ خانۂ کعبہ سے ہٹی ہوئی ہے تو پھر مسجدوں کا صحیح رُخ بھی نمازوں میں کوئی معنویت پیدا نہیں کر سکتا۔ عبادت کا اصل مقصود توجہ الی اللہ ہے، یہانتک کہ "قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں" چہ جائیکہ مسجد یا سمت مسجد کو اصل مقصود قرار دینا کہ اس سے زیادہ گری ہوئی بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ علامۂ مشرقی کا مقصود مسلمانوں میں اجتماعیت پیدا کرنا نہیں، بلکہ ان میں افتراق پیدا کرنا، اور ایک خاص جماعت ایسی بنا لینا ہے جو اُن کے مخصوص اغراض کی تکمیل میں ان کو مدد پہونچائے۔ مسلمانوں کی حالت چونکہ اسوقت بالکل اس شعر کے مصداق ہے کہ:-

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس لئے علامۂ مشرقی مسجدوں کا رُخ بدلدیں، کعبہ ہٹا کر کسی دوسری جگہ لیجائیں، جو چاہیں کریں، لیکن جب منزل حقیقتوں کے بے نقاب ہونے کی آئے گی اسوقت مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ
"ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں"

ہمیشہ یاد رکھئے

پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا کیونکہ ڈاکخانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر نگار - لکھنؤ

معلومات

نازی بچوں کی ریاضی

جرمنی میں بچوں کے لئے ریاضی کا جو کورس بنایا گیا ہے اس میں اس قسم کے سوالات نظر آتے ہیں :-

۱- ایک ملکی مشین گن ۲۵۰ کارتوس صرف کرنے کے بعد ۲۰ آدمی ہلاک کرتی ہے بتاؤ کہ اوسط کیا پڑا ؟

۲- قبل اس کے کہ ہر ہٹلر نے ۱۶ مارچ ۳۵ء کو اپنے تئیں مسلح کرنے کا اعلان کیا، سرحد پر مخالف ملکوں کے ہوائی جہاز اس نسبت سے جمع تھے :- انگلستان ۱۷۰۰- بلجیم ۲۰۰۰ - فرانس ۳۰۰۰ - اٹلی ۱۳۰۰ - زیکو ۸۰۰ - پولینڈ ۱۲۰۰ - روس ۳۰۰۰ - ایک نقشہ کھینچکر ان اعداد کو ظاہر کرو۔

والیٹر کی ذہانت

جب ۱۷۲۶ء میں والیٹر فرانس سے انگلستان پہونچا تو دیکھا کہ وہاں فرانس کے خلاف سخت ہنگامہ برپا ہے اور اس کی جان خطرہ میں ہے - ایک دن مجمع نے اسے گھیر لیا اور ہر طرف سے یہ آواز بلند ہونے لگی کہ " اس فرانسیسی کو مار ڈالو "

والیٹر کھڑا ہو گیا اور اس نے مجمع کو مخاطب کرکے کہا کہ " تم لوگ مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو اس لئے کہ میں فرانسیسی ہوں، لیکن کیا تمھارے نزدیک میرے لئے یہ سزا کم نہیں ہے کہ میں انگلستان کا باشندہ نہیں ہوں "

مجمع منتشر ہو گیا اور وہ اپنی جائے قیام پر صحیح سلامت پہونچ گیا۔

زہر کی شناخت مچھلی کے ذریعہ سے

جب کوئی شخص مشتبہ حالت میں مرتا ہے تو اس کے جگر کا معائنہ کیا جاتا ہے، کیونکہ زہر کے ذرات یہاں ضرور کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں، لیکن بعض صورتوں میں وہ اتنے کم ہوتے ہیں کہ معمولی تجزیہ سے پتہ نہیں چلتا اور جگر کا افشردہ چوہے کے جسم میں پچکاری کے ذریعہ سے پہونچایا جاتا ہے کیونکہ چوہا بہت ذکی الحس ہوتا ہے اور زہر کے اثر کو فوراً قبول کرتا ہے - تاہم اگر زہر کی مقدار بہت قلیل ہو تو چوہا بھی اس سے متاثر نہیں ہوتا - اس کے لئے اب مچھلی کو تلاش کیا گیا ہے - جگر کا افشردہ پانی میں ڈالدیا جاتا ہے اور مچھلی اس میں چھوڑ دی جاتی ہے - اگر اس میں قلیل ترین مقدار بھی زہر کی ہوتی ہے تو مچھلی پر فوراً اس کا اثر ہو جاتا ہے -

۲۰۰۰ سال قبل بجلی کی بیٹری

عجائب خانۂ عراق کے مہتمم کو حال ہی میں بغداد کے قریب زمین کے اندر سے ایک عجیب وغریب ظرف دستیاب ہوا ہے۔ یہ ایک مٹی کا ظرف ہے جس کے اندر تانبہ کا ایک سلنڈر پایا جاتا ہے۔ اس کے نیچے کے حصہ پر تانبہ کی چادر چڑھی ہوئی ہے اور اندرونی حصہ پر اسفلٹ کی موٹی تہ ہے۔ سلنڈر کے اوپر کے حصہ میں ایک پلگ (Plug) ٹھوس لوہے کا لگا ہوا ہے۔ اس آلہ کا تعلق سوائے بجلی کے کسی چیز سے نہیں ہو سکتا۔

یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جو مسیح سے ۲۵۰ سال قبل پارتھین حکومت یہاں پائی جاتی تھی۔ اسی طرح کے اور تین چار ظرف بغداد کے قرب وجوار میں دریافت ہوئے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب سے ۲۰۰۰ سال قبل ہلکی بجلی پیدا کرنے کے لئے یہ آلات طیار کئے جاتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ ان سے علاج کا کام لیا جاتا ہو۔

دنیا کا سب سے پرانا اخبار بند ہو گیا

جاپان میں ایک اخبار "پیپنگ پاؤ" ۲۷۰ سال قبل جاری ہوا تھا اور اپنی آزادرائے کے لئے مشہور تھا۔ اس کے بہت سے اڈیٹر بادشاہ پر نکتہ چینی کے الزام میں قتل کئے گئے، لیکن یہ اخبار برابر اسی شان کے ساتھ جاری رہا۔ لیکن جاپان کی عسکری حکومت نے اب اس کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

حوادث کا نشانہ

آئی اووا (Iowa) میں ایک شخص ہینک شیفر نامی رہتا ہے جو حوادث کے لحاظ سے نہایت بدقسمت انسان سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ جوان تھا تو کوئلہ کی کان میں دب گیا۔ اس کے چند سال بعد معدن میں دھماکا ہونے کی وجہ سے اس کی ایک ٹانگ اور ایک آنکھ غائب ہو گئی، پھر وہ پچاس فٹ کی بلندی سے گرا اور سر کو سخت صدمہ پہونچا، وہ مشکل سے اچھا ہوا تھا کہ گھوڑے نے لات ماری اور پھر اسپتال پہونچ گیا۔ ۸۰ سال کی عمر میں اسے دونوں پھیپھڑوں کا نمونیا ہو گیا۔ ۸۲ سال کی عمر میں ایک گھوڑا اسے کچلتا ہوا گزر گیا اور ۸۴ سال کی عمر میں ایک موٹر کے نیچے آگیا۔ تین دفعہ اس پر بجلی بھی گر چکی ہے اور اب کہ اس کی عمر کی آخری ساعتیں ہیں، اس کی ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔

پانچ کرور سال قبل کی مچھلی

گزشتہ دسمبر میں شمالی افریقہ کے سمندر سے ایک مچھلی نکلی ہے جو اب سے پانچ کرور سال قبل پائی جاتی تھی۔ بوہیریا کے پہاڑوں سے مچھلی کا جو ڈھانچہ برآمد ہوا تھا، وہ بالکل اسی مچھلی کا تھا اور اس زمانہ کا تھا جب یہ پہاڑ پانی سے ڈوبے ہوئے تھے۔

حیرت ہے کہ پانچ کرور سال میں بھی اصول ارتقا نے مچھلی کی اس قسم پر اپنا کوئی عمل نہیں کیا۔

تنوعات

دنیا میں سب سے پہلے ہڑتال مسیح سے ۳۲۸۵ سال قبل، مصر کے مزدوروں نے کی تھی جب ایک ہرم (Pyramid) کی تعمیر کے دوران میں ہلدی کم پڑ گئی تھی ——— ایک معمولی ریشمی موزہ میں ۵۰ میل لمبا ریشم کا تار ہوتا ہے ——— تیتریاں اپنی زبان کو کمان کی طرح لپیٹے رکھتی ہیں ——— اگر ایک مکڑی کرۂ ارض کے چاروں طرف ایک تار کا جالا بُن دے تو اس کا وزن ایک پونڈ ہوگا ——— امریکہ میں ۲۱۳ مذہبی طبقے پائے جاتے ہیں ——— ہیرا وزن کرنے کی ترازو اس قدر مکمل ہوتی ہے کہ ایک پنک یا خاک کے چند ذرے بھی اس کے پلڑے کو جھکا دیتے ہیں ——— گرمیوں میں انسان کا وزن کچھ بڑھ جاتا ہے ——— جب شہد کی مکھی کو کسی پھول میں شہد کی موجودگی کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ اس کو پکڑ اپنے چھتہ کی طرف اُڑ جاتی ہے اور یہاں وہ رقص کرنے لگتی ہے، یہ دیکھ کر تمام مکھیاں سمجھ جاتی ہیں اور اس کے ساتھ چلی جاتی ہیں ——— وسط یورپ کی موجودہ سیاسیات کو دیکھ کر امریکہ کے محکمۂ تعلیم کو ہدایت کی گئی ہے کہ فی الحال یہاں کا جغرافیہ بچوں کو نہ پڑھایا جائے اور نقشے چھاپنا بند کر دئے جائیں ——— اہل چین سیاہ انڈے کھانے کے بڑے شایق ہیں، اس غرض کے لئے انڈے زمین میں دفن کر دئے جاتے ہیں اور کئی سال کے بعد جب ان کی زردی بالکل سیاہ ہو جاتی ہے تو نکال کر کھاتے ہیں ——— جاپان کے پجاریوں کا زیادہ وقت اس بات میں صرف ہوتا ہے کہ وہاں کے مچھلی کھانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہیں، کیونکہ بودھ مذہب کی رو سے کسی کی جان لینا یا گوشت کھانا سخت ممنوع ہے ———

سمندر کی موجوں کی بلندی ۲۵ سے ۵۰ فٹ تک ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ بلند موج ۸۰ فٹ کی تھی جو ۲۲ء میں دیکھی گئی ——— انگریزی کے ۲۶ حروف سے جتنی ممکن صورتیں امتزاج کی پیدا ہو سکتی ہیں ان کا ایک شخص نے برسوں کی محنت کے بعد ریاضی سے حساب لگایا ہے کہ ان کی تعداد ۶۲۰۴۴۸۴۰۱۷۳۲۳۹۴۳۹۳۶۰۰۰۰ ہوتی ہے ——— چینی زبان کے حروف ہجا ۵۰۰۰۰ ہیں ——— افریقہ میں ایک قوم کاردن کے نام سے موسوم ہے ان کے یہاں یہ رسم ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی بیوی کو چُرا لیتا ہے تو سردار قبیلہ قوم

کے اور بڑے بڑے آدمیوں کو بلاکر مشورہ کرتا ہے اور اگر اس زمانہ میں اتفاقاً گوشت کم میسر آتا ہے تو اسے بھون کر کھا جاتے ہیں ——— مہاراجہ میسور کے پاس ایک گائے ہے جو اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ دودھ دینے والی گائے ہے اس کا وزن ۱،۷۰۳ پونڈ ہے اور ۱۰۵ پونڈ سے زیادہ روز دودھ دیتی ہے ——— ہیرے پر اگر ریڈیم شعاع ڈالی جائے تو وہ سبز ہو جاتا ہے ——— سمندر کی سب سے زیادہ گہرائی اس وقت تک جاپان اور فلپائن کے درمیان دریافت کی گئی ہے ۳۴۰۰۰ فٹ ہے ——— سر کا سب سے زیادہ نازک حصہ گدی ہے ——— تیتریاں اپنے پاؤں سے چکھنے کا کام لیتی ہیں اور اُن کی یہ حس ۱۶۰۰ گنا انسانی حس سے زیادہ قوی ہوتی ہے ——— برف کے بلورات کی ہزاروں تصویریں لی گئی ہیں لیکن ان میں کوئی ایک دوسرے سے نہیں ملتی ——— ہر لفظ جو منہ سے نکلتا ہے وہ ہمارے ۷۲ مختلف عضلات کی حرکت کا نتیجہ ہوتا ہے ——— دنیا میں روزانہ ۴۴۰۰۰ طوفان برق باد آتے رہتے ہیں ——— شہر امسٹرڈم ۹۰ جزیروں پر تعمیر ہوا ہے ——— دنیا کی آبادی میں نصف سے زیادہ ایسی ہے جو روزانہ تین بار چاول کھاتی ہے ——— دنیا کی تمام زبانوں کے حروف ہجا میں پہلا حرف وہ ہے جس کی آواز آ یا الف سے پیدا ہوتی ہے ——— جیمس گارفیلڈ امریکہ کا پریسیڈنٹ بیک وقت ایک ہاتھ سے لاطینی خط اور دوسرے ہاتھ سے یونانی خط لکھ سکتا تھا ——— آرجنٹنا کے صوبہ سینٹیاگو میں ایک انجینیر نے برقی مقناطیسی شعاعوں کے ذریعہ سے پانی برسانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے ——— دنیا کا سب سے زیادہ تیز خوشبو رکھنے والا درخت امریکہ کا زقوم (تھوہڑ) ہے جس کی ایک کلی کی خوشبو نصف میل پر محسوس ہوتی ہے ——— مشین گنوں کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے خشک برف استعمال کیا جاتا ہے ——— گلاب کا ایک پونڈ تیل حاصل کرنے کے لئے ۸۰ ٹن پھولوں کی ضرورت ہوتی ہے ——— نیلے رنگ کی وھیل مچھلی دنیا کے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ عظیم الجثہ جانور ہے، جس کی لمبائی پیدا ہوتے وقت ۲۴ فٹ ہوتی ہے ——— سمندروں میں اتنا نمک پایا جاتا ہے کہ اس سے ۴۸ لاکھ مکعب میل کی چٹان طیار ہو سکتی ہے ——— مادہ شتر مرغ دن کو انڈوں پر بیٹھتی ہے اور نر رات کو۔

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ ر - رعایتی ۱۲ر - علاوہ محصول - منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

شہر یار دکن کا ایک فرمان قرآن پاک کی روشنی میں

اعلانِ اصلاحات کے سلسلہ میں اعلیٰ حضرت شہر یار دکن نے جس بلند نظری اور علوے فطرت سے کام لیا ہے سیاست و تدبر کے لحاظ سے اُس کا جو مرتبہ ہے وہ تو سبھی جانتے ہیں لیکن اگر نظر کو کسی قدر اور وسعت دیجائے اور واقعات کی تمام کڑیوں کو ملاکر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عقل انسانی کا یہ وہ کارنامہ ہے جس کا تعلق دنیائے آب و گِل سے نہیں بلکہ اُس عالم روحانیت سے ہے، جو "تاج پوشں" نہیں بلکہ "تاج بخش" ہستیوں کے لئے مخصوص ہے

جن حضرات نے دورِ عثمانی کا غایر مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ دکن کا موجودہ فرمانروا، اپنی سیاسیات، اپنے اُصول حکمرانی اور اپنی خانگی زندگی کے لحاظ سے قدرت کا وہ عجیب و غریب مظہر ہے جس میں انسانیت کا علو، اخلاق کا ارتقاء اور فراست و تدبر کا استعلاء، انتہائی نقطۂ عروج تک پہونچا ہوا نظر آتا ہے اور جس کی مثال، زمانہ ہزاروں کروٹیں لینے کے بعد بھی مشکل ہی سے کبھی کبھی پیش کر سکا ہے

اعلیٰحضرت کی اصابتِ فکر و رائے اور حریت ذہن و ضمیر کی اتنی روشن مثالیں دنیا کے سامنے موجود ہیں کہ ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں، لیکن حال ہی میں اصلاحات کے اعلان اور اس کے بعد ۶ راگست کے فرمان خصوصی نے جو مہر توثیق ان پر ثبت کردی ہے وہ تاریخ حکومت و سیاست کا یادگار واقعہ ہے

اصلاحات کے اعلان کے بعد اندرونِ ملک میں ایک خاص قسم کی شورش پیدا ہو چلی تھی اور اس کی مختلف تدبیریں لوگوں کے ذہن و دماغ میں کام کر رہی تھیں، لیکن جس اُصولی غلطی کی بنا پر یہ سارا ہنگامہ برپا ہو رہا تھا اس کو سب سے پہلے اعلیٰحضرت ہی کی نگاہ رمز شناس نے پہچانا اور اولین فرصت میں اس کی وضاحت و تصحیح فرماکر اپنے حکیمانہ فرمان کے چند جملوں سے "رئیس و ریاست" کے تعلقات کا وہ کلیہ بیان کر دیا جو تاریخ سیاست میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے

ارشاد ہوتا ہے :-

"میں کچھ عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ عوام میں اور بخصوص ان کے لیڈروں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ

رئیس ایک شے ہے اور اس کی مقرر کردہ کونسل دوسری شے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے —
رئیس ہی کل ملک کی سود و بہبود کا واحد ذمہ دار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے مشیر بھی ۔ اگر کسی
وقت دونوں میں کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ہوگیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ دنیا میں اکثر ایسا ہوا کرتا
ہے اور ہر شخص اپنے زاویۂ نگاہ سے رائے دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
الحاصل پبلک کو اچھی طرح سے جاننا چاہئے کہ بسا اوقات رئیس اپنی کونسل کے مشورہ یا تجاویز کو
قدر کی نظر سے دیکھتا ہے یہ سمجھکر کہ سب اس کے وابستگان سے ہیں اور وفادار ہیں اور یہ گروہ اس قسم کا نہیں
ہے جس نے ناعاقبت اندیشی یا خود غرضی کو اپنا شعار بنایا ہو ــــــــــــــــ "

یہ ہیں الفاظ اس فرمان کے جس کا ایک ایک لفظ دنیائے معانی اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے —

اس سے قبل بھی جب کوئی فرمان یا تحریر اعلیٰحضرت کی میری نگاہ سے گزری ہے ، میں نے ہمیشہ اس کے اندر ایک اشارۂ غیبی محسوس کیا ہے ، اور جب یہ فرمان میری نگاہ سے گزرا تو اس وقت بھی میں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا اور فوراً سورۂ آلِ عمران کی وہ آیت میرے سامنے آگئی جس میں رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے :-

" وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ، فَإِذَا عَزَمْتَ ، فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ " —

(یعنی اے رسول اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرو اور جب تم کوئی ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرکے اسے کر گزرو ، کیونکہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں)

کلام مجید کی یہ آیت اک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی ، لیکن کلام خداوندی کی یہ بلاغت ہے کہ اس کے احکام خصوصی میں بھی ، اصولِ عمومی کی تعلیم پنہاں رہتی ہے ، چنانچہ اس آیت کے ذریعہ سے رسول اللہ کو ایک عام اصولِ سیاست و سیادت یہ بتایا گیا ہے کہ مشیروں سے مشورہ کرو اور اگر اس مشورہ کی بنا پر تم نے کوئی ارادہ استوار کرلیا ہے تو ضرور اس پر عمل کرو ۔

چونکہ اعلیٰحضرت کو اپنی بے نظیر عالمانہ بصیرت کے لحاظ سے قرآن مجید اور احادیث نبوی پر خاص عبور حاصل ہے اس لئے مجھے یقین ہے کہ جب یہ فرمان سپردِ قلم فرمایا گیا ہوگا اُسوقت سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت بلکہ ایسی تمام آیتیں جو مشورے کی اہمیت پر نازل ہوئی ہیں ، اعلیٰحضرت کے پیشِ نظر ہوں گی جبھی تو فرمان مبارک میں بھی پبلک کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ " رئیس اور اس کی کونسل کو دو علٰحدہ چیزیں سمجھ لینا سخت غلطی ہے "

اس آیت میں ایک اور نکتہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ " شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ " کے بعد " فَإِذَا عَزَمْتَ " کی قید لگا دی گئی ہے ، یعنی مشیروں کی رائے پر عمل کرنا اسی وقت قرینِ مصلحت ہے جب تم کو بھی اس پر اطمینان ہو ، لیکن اگر تمہیں اطمینان نہ ہو تو پھر خدا پر بھروسہ کرکے جو تم مناسب سمجھتے ہو وہی کرو

فرمانِ مبارک میں بھی بہ الفاظ دیگر اسی نکتہ کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ "رئیس ہی کل ملک کی بہبود کا واحد ذمہ دار ہے اور اگر کسی وقت دونوں میں کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ہو گیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں" یعنی رئیس نہ اپنے مشیروں کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور نہ اختلاف رائے کی صورت میں عمل نہ کرنے پر مامور۔ اصل چیز نیت کا خلوص ہے اور اس بنا پر اگر باوجود اختلاف کوئی رئیس اپنی کونسل کے مشورہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو یہ اس کی قایدانہ بلند نظری ہے، چہ جائیکہ خود رئیس بھی اپنے مشیروں کی رائے کو پسند کرتا ہو کہ اس صورت میں تو پھر وہی "فتوکل علی اللہ" کی ہدایت سامنے آتی ہے، جس پر ہمیشہ اعلیٰحضرت کی پرائیوٹ و پبلک زندگی کا انحصار رہا ہے اور جس کی بنا پر اعلیٰحضرت کی ذات گرامی کو بجا طور پر آیۂ رحمتِ الٰہی قرار دیا جاسکتا ہے

اصلاحات کے اعلان کے بعد ملک کے بعض افراد اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے صرف کونسل کی مرضی سے ہو رہا ہے اور اعلیٰحضرت کی پسندیدگی کو اس میں دخل نہیں ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اعلیٰحضرت اور کونسل کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسی بات تھی جس سے اقتدار شاہانہ پر اثر پڑتا تھا اور دکن کی پبلک کو جو اعلیٰحضرت سے انتہائی عقیدت و اُلفت رکھتی ہے بیشک متفکر و متردد ہونا چاہئے تھا، لیکن چونکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف تھی اور دکن کی تمام اصلاحات و ترقی کا سرچشمہ اعلیٰحضرت ہی کی ذاتِ اقدس ہے، اس لئے حضرت حکیم السیاست نے فوراً پبلک کی اس دُکھتی ہوئی رگ کو پکڑ لیا اور ایک خاص فرمان کے ذریعہ سے وہ تمام حقیقتیں بے نقاب کر دیں جو عوام کی نگاہوں سے چھپی ہوئی تھیں

اگر دکن کی کوئی جماعت واقعی ان اصلاحات کا سررشتہ اعلیٰحضرت کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں تصور کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے فرمانروا کو ابھی تک سمجھا ہی نہیں اور وہ شہریارِ دکن کی اُن بلند خصوصیات سے بالکل بے خبر ہے جو جادۂ شریعت ہی پر چلنے والے فرمانروا میں پائی جاسکتی ہیں

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دکن کے مسلمان، ذات شاہانہ کے اس غیر معمولی شرف و امتیاز کو انحطاطِ اقتدار پر محمول کرتے ہیں اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک مسلمان فرمانروا کی اصلی شان "اخذ و تناول" نہیں بلکہ "فضل و عطا" ہے۔ وہ اتنا لیتا نہیں جتنا دیدیتا ہے، اس کے یہاں "دار و گیر" نہیں بلکہ "بخشش و کرم" ہے۔ وہ جسم کے ساتھ جان و روح پر بھی فرمانروائی کرتا ہے، دُکھ درد دور کرنے میں رنگ و نسل کا امتیاز اس کے سامنے نہیں ہوتا اور جب وہ فریاد کو پہونچتا ہے تو اس کی آنکھیں یہ نہیں دیکھتیں کہ فریاد کرنے والا کون ہے

اس لئے اس وقت جو محاذ اصلاحات کے خلاف وہاں قایم ہوا ہے وہ کسی سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا اور اب کہ فرمان خصوصی نے ان حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا ہے یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے اور اگر بعض افراد اب بھی اس پر اصرار کریں تو پبلک کو ان کے ساتھ بہت سمجھکر اور سنبھل کر قدم اُٹھانا چاہئے کیونکہ ان کا یہ فعل اعلیحضرت کی سرتابی میں شمار ہوگا جسے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی

جنوری سنہ ۴۰ء کا "نگار"

نظیر اکبر آبادی نمبر ہوگا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دیجا چکی ہے وہ اہل قلم جو نظیر اکبر آبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دیجاتی ہے۔

حسب ذیل حضرات لکھ رہے ہیں، لیکن نہ کوئی عنوان کسی کے لئے مقرر ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایک عنوان پر ایک ہی صاحب کا مقالہ ہو۔

نظیر و کبیر	=	پروفیسر فراق گورکھپوری ام۔اے
نظیر اور اُردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز	=	پروفیسر مجنوں گورکھپوری ام۔اے
نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں	=	مولوی امیر احمد علوی بی۔اے
نظیر کا مذہبی مسلک	=	ل۔احمد اکبر آبادی
نظیر کی ہندوانہ نظمیں	=	ڈاکٹر لکشمی دت صاحب
نظیر کے تلامذہ اور ہمعصر اساتذہ	=	جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبر آبادی
نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات	=	مولانا عبدالباری آسی
نظیر کا فلسفۂ زندگی و نظریۂ اخلاق	=	جناب مخمور اکبر آبادی بی۔اے
نظیر کی خصوصیات لسانی	=	جناب مولانا سیماب اکبر آبادی

(نوٹ) نظیر نمبر کی کتابت ماہ آیندہ شروع ہو جائے گی اس لئے براہ کرم جلد توجہ فرمائیے اور اپنا مقالہ بھیجکر ہم کو موقعہ دیجئے کہ اس کے لئے موزوں جگہ نکالی جاسکے۔

نیاز

ٹوٹے ہوئے تارے

کہا ہے مجھ سے یہ ٹوٹے ہوئے ستاروں نے
نوائے درد میری کہکشاں میں ڈوب گئی
سمن برانِ فلک نے شرر کو دیکھ لیا،
وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارہ نہ تھا
دلوں میں بیٹھ گیا تیر آرزو بن کر
یہ ساکنانِ فلک دردِ غم کو کیا جانیں،
وہ غم کو پی تو گئے آنسوؤں کو پی نہ سکے
فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے

فلک کے گود سے چھوٹے ہوئے ستاروں نے
وہ چاند تاروں کے سیلِ رواں میں ڈوب گئی
زمین والوں کے دل کو نظر کو دیکھ لیا
وہ خاک داں کا مسافر تھا ماہ پارہ نہ تھا
فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر
یہ خاکیوں کی رہ بیش و کم کو کیا جانیں
زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے
زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیر آہ کے مارے

یہ آگ اور بھی اوپر نکل گئی ہوتی
حریمِ عرش کو چھو کر نکل گئی ہوتی

مخدوم محی الدین

جنگ

طبل کے بجتے ہی اُٹھا اک فلک پیما غبار
آسمانوں پر تباہی کا دھواں چھانے لگا
خوف سے گاوِ زمیں کے پاؤں تھرانے لگے
ڈھیر اک مٹی کا بن کر رہ گئے شہر و دیار
آگ کے طوفاں میں اب آتش بجاں ہو زندگی
ہے دل بیدار میں افسردہ جینے کی اُمنگ
بیکسوں کا نالۂ غمگیں کوئی سنتا نہیں
زندگی کی صبح دیکھ اور زندگی کی شام دیکھ
وہ پڑی پھرتی ہیں گلیوں میں بر افگندہ نقاب

موت کے قدموں پہ دنیا جھک گئی بے اختیار
جنگ کا پرچم ہوا میں پیچ و خم کھانے لگا
توپ گرجی، حشر اُٹھا، زلزلے آنے لگے
خاک پر سر پیٹتی ہے قصر و ایواں کی بہار
وہ دھواں چھایا کہ دب کر رہ گئی رخشندگی
چشمِ بینا میں ہے نقشِ زندگی بے آب و رنگ
رحم و نیکی کا فریبِ عقل سر دھنتا نہیں
دیکھ، اے انساں! ہوس کاری کا یہ انجام دیکھ
جن کے جلوؤں کو ترس جاتی تھی چشمِ آفتاب

بے زبانوں کے گلے میں طوق ڈالا جائے گا
بول، اے تہذیبِ حاضر! تجھ سے دیکھا جائیگا

کاوش حیدر آبادی

مسائلِ لطیف

بہارِ نظر آسماں پر بچھا دے
ستاروں کو کچھ خوبصورت بنا دے

ہے مدھم سا یہ شیشۂ سرد ساقی
ذرا ساغرِ ماہ کو جگمگا دے

ہے شبنم سرشتوں کا ایماں محبت
رضا جوئی آفتابِ فنا دے

وہی گرم و تیز اور وحشی محبت
وہی خوئے انجام ناآشنا دے

بقا، اک ہوس کی ہے بگڑی سی صورت
مری زندگی کو خلوصِ فنا دے

غم ناشناسی سے دل بجھ گیا ہے
مجھے اک رفیقِ مزاج آشنا دے

بہت گفتگو کر چکا ہے زمانہ
مجھے بھی کسی روز اذنِ نوا دے

بہت مشکلیں سامنے ہنس رہی ہیں،
ذرا تو بھی اے ماہ وش مسکرا دے

بہت آفتیں پیچ و خم کھا رہی ہیں،
ذرا ان کو اک تیز چتون دکھا دے

سمندر کو ہے وہم گہرائیوں کا
مرے دل کے گوشے سے پردہ ہٹا دے

حوادث کا پندار زک کھا چکا ہے
ذرا آپ ہی اب تو گردن جھکا دے

وہ آتشکدے ہار کر بجھ چکے ہیں،
کسی اور آتشکدے کو جلا دے

مری وحشتوں میں ابھی حوصلے ہیں
کڑکتی ہوئی بجلیوں کو صدا دے

مرے بازوؤں میں ابھی شورشیں ہیں،
کسی مست طوفاں کا شانہ ہلا دے

مرے گرم انفاس مائل بہ ضد ہیں
ذرا آندھیوں کو توجہ دلا دے

مری اک غزل آتشیں لے میں پڑھ کر
فسردہ عناصر سے شعلے اٹھا دے

تعین کا افلاس ہے حدِ ہستی
ذرا اس کو حدِ عدم سے ملا دے

عدم

شکستِ نایاب

کیرم کی ایک بازی کے دلچسپ تاثرات

سچ ہے کہ بہت رات گئی بج چکے بارا کیا کیجئے کیرم کا ہے کچھ کھیل ہی پیارا
تم کھیل میں ہو، مجھ سے ہے کچھ حال ہمارا خیرہ نگرِ شوق ہے، حیراں ہے نظارا
رکھوں نہ اگر پاؤں، زمیں پر تو بجا ہے ذرے کو ہے مہتاب نے کرنوں سے سنوارا
رہ رہ کے ہمیں تہنیتِ عشق و وفا میں پرویز نے آواز دی، زہرہ نے پکارا
کس بات میں ہم کم ہیں، فلک سر نہ اٹھائے اک چاند ہے اُس کا، تو ہے اک چاند ہمارا
لیکن یہ قیامت ہے کہ پہلو میں سمٹ کر دشوار نگاہوں کو ہے نظارا تمھارا
ابتک تو بڑے ضبط سے ہم کھیلے ہیں لیکن کیا کہئے کہ اب کھیل کی ہمت ہے نہ یارا
مہروں کی جگہ گرتا ہے ہر ہاتھ میں ضارب بیتاب ہے جب دل ہی تو کیا کھیل ہمارا
اُف تم ہو کہ ہر وار میں پہلے سے بھی ہشیار ملتا ہے تمھیں میری شکستوں کا سہارا
جس جیب کی جانب اُٹھی انگشتِ حنائی، اُس جیب میں آہستہ سے اک مہرہ اُتارا
رخ کھیل کا بدلا ہے عجب لطف سے تم نے جو چال ہے اک سحر ہے، جو ہاتھ ہے پیارا
ہر آن میں ضربوں کا نیا رنگ ہے کیا خوب ہر لحظہ میں ہے کھیل ترقی پہ تمھارا
جس جیب کو دیکھا وہی پھولی نہ سمائی اک آن میں بازی کا ہوا وارا نیارا
افلاک کی گردش بھی اگر سچ ہے تو ہے جھوٹ اعجاز ہے، مہروں کا یہ رقصِ نظر آرا
اُڑتے ہوئے مہروں کا یہ اُٹھتا ہوا طوفان جیبوں کی طرف میرا یہ حسرت سے نظارا
سچ پوچھو تو یہ بات کی اک بات ہے ورنہ بچتا ہے کہیں ہار سے بھی عشق کا مارا
کیرم ہی پہ موقوف ہے کیا میری تباہی سچ یہ ہے کہ تم سے تو میں ہر کھیل میں ہارا

اس ہار پہ بھی دل کو بہت ناز ہے فطرت
یہ ہار بھی شاید ہی، ہو قسمت کو گوارا

فطرت واسطی

عالمِ برشگال

اے بیم و امید کس بلا میں دل ہے، — منزل پہ یقین کی گزر مشکل ہے
برسے یا لے اُڑے ہوا کیا جانیں، — لپٹا ہوا بادلوں میں مستقبل ہے،

یہ کس کا دل و داغ لیکر نکلے — کس کی فرقت کا داغ لیکر نکلے
برسات کی تاریک شبوں میں یارب — جگنو یہ کدھر چراغ لیکر نکلے

کوئل نے بھی حشر اُٹھا دیا ہے ہمدم — احساس کو تھرتھرا دیا ہے ہمدم
فریاد کناں ہے کسی شاعر کی یہ روح — دنیا نے جسے بھلا دیا ہے ہمدم

برسات نے منھ زخمِ جگر کا کھولا — پھر دل کے لہو میں درد کا رس گھولا
وہ دل سے کراہنے کی آواز آئی، — وہ دور کسی طرف پپیہا بولا،

نجم آفندی

چند قابلِ مطالعہ کتابیں

واردات :- منشی پریم چند آنجہانی کے جادو نگار قلم کے ۱۳ تازہ ترین مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، کاغذ طباعت اعلیٰ تقریباً ۳۰۰ صفحات - قیمت مجلد صرف عہ

جنون و حکمت :- شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی والہانہ رباعیات کا دلکش مجموعہ قیمت عہ۸ر

شعلۂ طور :- (طبع ثانی) حضرت جگر مرادآبادی کا مکمل دیوان جس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور جو نئی ترتیب اور بہت کچھ تازہ کلام کے اضافہ کے ساتھ شایع ہوا تھا، قریب الختم ہے۔ قیمت عہ۸ر

دیوانِ غالب جرمنی :- دیوان کل ہے جس میں مرزا کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات قصائد اور رباعیات ہیں۔ جرمنی میں خاص طور سے چھپوایا گیا ہے۔ قیمت قسم اول عہ۸ر قسم دوم ؏ قسم سوم بغیر جلد عہ ر۔

منیجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

جوہرِ تخلیق شاہنامہ کی جنگ کاموس کشانی کا ترجمہ ہے اُردو نظم میں۔ جناب سید محمد علی صاحب حشم داعی پوری اسکے مترجم ہیں، جن کو شاہنامہ سے بہت شغف ہے اور جو ابتداءِ عمر سے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

جنگ کاموس کشانی، فردوسی نے تین ہزار اشعار میں پھیلا کر بیان کی ہے، لیکن جناب حشم نے مختصر کرکے تقریباً ۹۰۰ اشعار میں اس کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔

اگر شاہنامہ کو بند کرکے ترجمہ کو دیکھا جائے تو اس کی سادگی و برجستگی کی داد دینا پڑے گی، لیکن اصل سے فی الحقیقت اس کو کوئی نسبت نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ فردوسی کا سا جوش ترجمہ میں پیدا کرنا ممکن ہی نہیں۔

مثالاً میں چند اشعار فردوسی کے اور اسی کے ساتھ ترجمہ پیش کرتا ہوں جس سے دونوں کا فرق معلوم ہوگا فردوسی ایک جگہ تیر اندازی کی تصویر کھینچتا ہے اور ترکش سے تیر نکالنے کے وقت سے لیکر اس کے پیوست نشانہ ہونے تک تمام جزئیات کا استقصار کرتا ہے اس کے بعض اشعار یہ ہیں:-

خدنگے برآورد پیکاں چو آب   نہادہ بر او چار پر عقاب

اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:-

کماں میں رکھا ناوک بے اماں   جمیں قبضۂ چرخ پر اُنگلیاں

پہلے مصرعہ میں بے اماں کا لفظ بالکل برائے بیت استعمال کیا گیا ہے اور پیکاں کی جو خوبی فردوسی نے ظاہر کی ہے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ دوسرے مصرعہ میں فردوسی نے صرف ضمیر (او) سے کام لیا تھا اور ترجمہ میں اس کی جگہ "قبضۂ چرخ" استعمال کیا گیا ہے جو علاوہ ثقیل ہونے کے اس لحاظ سے غلط بھی ہے کہ "او" کا اشارہ خدنگ کی طرف ہے نہ کہ "قبضۂ چرخ[1]" کی طرف اور چار پر عقاب کا ترجمہ اُنگلیاں تو اس قدر عجیب و غریب چیز ہے کہ کسی کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔

---

[1] چرخ مجازاً آسمان کو بھی کہتے ہیں۔

اس کے آگے فردوسی لکھتا ہے :۔

بمالید چاچی کماں را بدست | بچرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست | خروش از خم چرخِ چاچی بخاست

اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے :۔

لیا بوسۂ شست سوفار نے | کیا سخت چٹکی کو جرار نے
یہ پیچھے ہٹا وہ بڑھا ساتھ ساتھ | جھکا ایک سیدھا ہوا ایک ہاتھ

ترجمہ میں دونوں شعر کے پہلے مصرعے بالکل بیکار ہیں۔ اخیر کے دو شعر ملاحظہ ہوں :۔

چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس | سپہر آں زماں دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ، | فلک گفت احسن ملک گفت زہ

ترجمہ کیا گیا ہے :۔

نشانہ بنا سینۂ اشکبوس | دلیر کشانی ہوا خاکبوس
جھکا دست بوسی کو چرخ کہن، | قضا نے صدا دی بگیر و بزن

فردوسی کا دوسرا شعر بالکل الہامی ہے اور اسی کے دوسرے مصرعہ کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

اس سے میرا مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں کہ فاضل مترجم کی کاوش بالکل بے معنی ہے، لیکن اس کی کوئی خاص افادی صورت میرے سامنے نہیں۔ شاہنامہ سے لطف اُٹھانے والے ترجمہ کو دیکھیں گے نہیں اور جو ترجمہ پڑھنے والے ہیں وہ شاہنامہ سے لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ اگر نثر ہی میں اس داستان کا ترجمہ کر دیا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ اُن ادبی و لسانی خصوصیات کو بھی ظاہر کر دیا جاتا جو فردوسی کے کلام میں پائی جاتی ہیں تو بیشک یہ ادبی خدمت ہوتی۔

اس کا نام جوہر تخلیق صرف اس لئے رکھا گیا کہ یہ ہجری مادۂ تاریخ ہے، ورنہ اصل داستان سے اس نام کا کوئی تعلق نہیں۔

کتابت و طباعت نہایت اچھی ہے اور قیمت ۸/ ۔ ملنے کا پتہ درج نہیں۔

روح غالب غالب کے اُردو مکاتیب کا انتخاب ہے جس کے ساتھ ان کے حالات زندگی بھی دیدئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اس کے مرتب ہیں اور ادارۂ ادبیات اُردو نے اسے حیدر آباد سے شایع کیا ہے، لکھائی چھپائی نفیس ہے اور قیمت ۶/

خواب کی دنیا مولانا عبدالمالک آروی کی تصنیف ہے اور اُردو میں بالکل پہلی کتاب ہے جو اس موضوع

پر اس قدر جامعیت کے ساتھ پیش کی گئی ہو۔ اس میں نہ صرف آسٹریا کے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فریوڈ کی کتاب کی تلخیص ہے بلکہ مغرب و مشرق کے اور بہت سے ماہرین نفسیات کی تحقیق "خواب" کے بارہ میں پیش کیگئی ہے۔ خواب کی حقیقت کیا ہے اور اس کی تعبیر کیا؟ یہ مسئلہ ہمیشہ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور لوگوں نے اس کی بڑی چھان بین کی ہے، لیکن اس وقت تک اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو محققین سلف کی ان تمام کاوشوں کو یکجا پیش کرتی ہو اس لئے مولانا عبدالمالک صاحب کی یہ کوشش حد درجہ قابل ستایش ہے اور امید کی جاتی ہے کہ ملک اس جنس گرانمایہ کی قدر کر کے مولانا کو موقعہ دے گا کہ وہ اپنی اور تصانیف بھی دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اس کی قیمت عمر ہے اور ملنے کا پتہ ادارۂ طاق بستاں۔ آرہ

روحِ حیات

جناب اختر قریشی کے چند مکاتیب کا مجموعہ ہے، جو اپنی ادبیت کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہیں۔ کہیں کہیں وجوہات اور فی زمانہ ایسی لغزشیں پائی جاتی ہیں لیکن خال خال۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے، قیمت ۳ر اور ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔ شروع میں حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ جناب حسین عابدی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی اختر صاحب کی تصویر بھی شامل ہے۔

ہمدردِ صحت ضبط تولید نمبر

ہمدرد دواخانہ دہلی سے ایک طبی رسالہ "ہمدرد صحت" عرصہ سے شایع ہو رہا ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسوقت ہندوستان میں کوئی طبی ادارہ ایسا نہیں ہے جو "ہمدرد صحت" کے معیار کا رسالہ شایع کر رہا ہو۔ اس وقت اس رسالہ کے کئی مخصوص نمبر شایع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں "ضبط تولید و اصلاح نسل" شایع ہوا ہے جو کئی سو صفحات کو محیط ہے اور اپنے مضامین کے لحاظ سے اس موضوع پر ایک دائرۃ المعارف کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ متعدد تصاویر و نقوش نے اس کی افادیت و دلچسپی میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی جو ہمدرد دواخانہ کے مالک اور ہمدرد صحت کے اڈیٹر ہیں، بڑی خوبیوں کے انسان ہیں اور ہر کام کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مختصر سے زمانہ میں نہ صرف دواخانہ کو غیر معمولی ترقی دیدی ہے بلکہ اتنی اور ایسی علمی خدمت انجام دی ہے کہ کوئی طبی ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہ خاص نمبر بارہ آنے میں ہمدرد منزل دہلی سے مل سکتا ہے۔

زندگی کے پھول

مجموعہ ہے جناب لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے بارہ فسانوں کا جو سماج کی اصلاح کے لئے سماج ہی کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

لطیف، اپنی انشاء لطیف کی وجہ سے اُردو کے انشاپردازوں میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں، لیکن یہ لوگوں

کو معلوم ہو گا کہ وہ نثر میں صرف شاعری ہی نہیں کرتے بلکہ قومی اصلاح بھی کرتے ہیں اور اس کتاب سے یہ حقیقت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔

فسانے چھوٹے لیکن نتیجے بڑے، زبان سادہ لیکن مفہوم رنگین یہ ہے اس مجموعہ کی خصوصیت جسے حال ہی میں انھوں نے شایع کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:- عظیم اطہر- منٹولہ- آگرہ۔

حیات وکلیات اسماعیل

اُردو کا کونسا طالب علم ایسا ہے جو "مولانا محمد اسماعیل میرٹھی" سے واقف نہیں ان کی ریڈریں اور ان کی نظمیں "دبستانی" حیثیت رکھتی ہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے ہر اُردو جاننے والے کی نگاہ سے گزر چکی ہیں۔ اس کتاب میں انھیں کے حالات درج ہیں اور انھیں کے کلام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

حالات میں ان کے نسب، ان کی تعلیم و تربیت، ملازمت، کے علاوہ اُن کے تعلقات دوستی و قرابت، اُن کے اخلاق اور ان کی تصنیفات و تالیفات پر بھی تاریخ وار تبصرہ کیا گیا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کتنی خوبیوں کے انسان تھے اور ان کی ترقی صرف ان کی فکر سلیم و سعی بلیغ کا نتیجہ تھی۔

کلام کے متعلق رائے زنی کی ضرورت نہیں۔ یہ اور حالی پہلے شخص تھے جو اُردو شاعری کے قدیم رنگ کو بدل کر اسے مغربی انداز پر لے گئے اور جنھوں نے بجائے خیال آرائی کے کام کی باتوں کی طرف توجہ کی۔ زبان کی سادگی، انداز بیان کی دلکشی، جزئیات نگاری اور مبالغہ سے احتراز ان کے کلام کی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے اُن کو مقبول بنایا اور جس کی پیروی بعد کو بہت سے حضرات نے کی۔

اس مجموعہ میں قطعات، قصاید، مثنویات، مربع، مخمس، مسدس، مثمن، ترجیع بند، غزلیات و رباعیات سبھی کچھ ہے اور ہر چیز موضوع کے لحاظ سے اپنی جگہ بے مثل ہے۔ آخر میں ان کا فارسی کلام بھی درج ہے جو بالکل پہلی مرتبہ میری نگاہ سے گزرا اور میں اس کی فارسیت دیکھ کر حیران رہگیا۔

یہ مجموعہ اُن کے بڑے صاحبزادہ جناب محمد اسلم سیفی نے شایع کیا ہے اور طباعت و کتابت وغیرہ میں خاص اہتمام صرف کیا گیا ہے۔

تصاویر میں مولانا کی تصویر بھی اس میں شامل ہے اور اُن کی تحریر کا عکس بھی۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ اور قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی، لاہور یا لکھنؤ۔

سنہرا حلقہ

یہ مجموعہ ہے چند ایسے خطوط کا جو سب ملکر ایک فسانہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ خطوط اُسی خاتون کی طرف سے لکھے گئے ہیں جو اس افسانہ کی ہیروئن ہے اور جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک عورت کتنا ایثار کر سکتی ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنی کوشش سے بہت کچھ اپنے مستقبل کو سنوار سکتی ہے

جناب ناظر کاکوروی نے بہت سلیقہ سے کام لیکن ان خطوط کو مرتب کیا ہے۔

ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو لکھنؤ ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً ۸؍ ہوگی۔

متاع اقبال مجموعہ ہے ابوظفر عبدالواحد ام۔ اے، لکچرار سٹی کالج حیدر آباد کے تین مقالوں کا جن میں اقبال کی شاعری، ان کے ذہنی ارتقا اور شاعرانہ فلسفہ سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے کہ اس وقت تک اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کو سامنے رکھ کر کسی نے کوئی قابل ذکر مقالہ نہیں لکھا اور چونکہ وہ بیس سال سے کلام اقبال کا والہانہ مطالعہ کر رہے ہیں اس لئے انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جسوقت ہم کتاب کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس میں ناکام رہے اور انھوں نے بھی اقبال کی شاعری یا اس کے فلسفہ کے اس پہلو کو چھوڑ دیا جسے سب چھوڑتے آئے ہیں۔ اقبال شاعر ہونے کے لحاظ سے اس میں شک نہیں غیر معمولی شخص تھا، لیکن مفکر ہونے کے لحاظ سے وہ زیادہ بلند مرتبہ کا انسان نہ تھا اور اسی کو ظاہر کرنے کی جرأت کسی میں نہیں ہوئی۔

بہر حال اس کے مصنف بھی اسی ایک لکیر کے پیٹنے والوں میں سے ہیں اور زیادہ سے زیادہ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے بھی اعتقاد و حُسن ظن سے کام لینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

یہ کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

قصاید نجم مجموعہ ہے جناب نجم آفندی اکبر آبادی کے چند رباعیات و قطعات و قصاید کا جو ائمۂ معصومین کی یاد میں لکھے گئے ہیں۔ جناب نجم یوں بھی ملک کے مشہور خوشگو شعرا میں سے ہیں اور ان کا رنگ شعر و سخن عمومی حیثیت سے ایک کیفیت رکھتا ہے، لیکن یہ مجموعہ مذہبی شغف کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اس لئے اس کے اثرات قدرتاً زیادہ قوی ہونا چاہئے۔

جناب نجم کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں اور اس سے اُستادانہ شان ٹپکتی ہے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ سرفراز پریس لکھنؤ۔

نادر خطوط غالب مجموعہ ہے غالب کے چند غیر مطبوعہ خطوط کا جو جناب پیارے لال شاکر میرٹھی کی کوشش سے طبع ہو کر ریویو کے لئے موصول ہوئے ہیں۔

اس مجموعہ کے مرتب جناب رسا ہمدانی ہیں۔ ان کے پرداد اشاہ کرامت حسین کرامت غالب کے شاگرد تھے اور مرزا کے جو خطوط ان کے پاس آتے تھے وہ انھیں محفوظ رکھ لیتے تھے۔ چنانچہ اس میں ۲۳ خطوط انھیں کے نام کے ہیں باقی چار میں سے تین صفیر بلگرامی کے نام کے ہیں اور ایک صوفی منیری بہاری کے نام کا۔

اس کی قیمت ۸؍ ہے اور ملنے کا پتہ "کاشانۂ ادب" لکھنؤ۔

سوشلزم

اُردو ترجمہ ہے فریڈرک اینگلز کی کتاب کا جسے ایڈورڈ ایولنگ نے انگریزی میں منتقل کیا تھا اس کا مصنف، کارل مارکس کا دستِ راست تھا اس لئے سوشلزم پر اس کے خیالات قدرِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اس موضوع کا غایر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا پڑھنا ضروری ہے

اس کے مترجم جناب باری، سوشلسٹ جماعت کے ایک پرجوش مرد ہیں جو احساس و عمل دونوں حیثیت سے اشتراکیت کی تبلیغ کر رہے ہیں، ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔ قیمت چھ آنے ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ اُردو لاہور۔

جواہر سخن چوتھی جلد

ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کے شعبۂ اُردو نے اُردو شعراء کے انتخاب جواہر سخن کے نام سے شایع کرنا شروع کئے ہیں۔ اس کی تین جلدیں پہلے شایع ہو چکی ہیں۔ یہ چوتھی جلد ہے جس میں زیادہ تر لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کے شعرا کا تذکرہ ہے۔

یہ تذکرہ نواب فقیر محمد خاں گویا سے شروع ہوتا ہے اور شاہ عبدالعلیم آسی پر ختم ہوتا ہے۔ حالات سے زیادہ انتخاب کلام پر توجہ کی گئی ہے۔ اس کی قیمت دو روپیہ ہے۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ

یہ پہلا حصہ ہے جس میں جناب محمد مرزا صاحب دہلوی نے مولانا محمد علی مرحوم مہاتما گاندھی، محمد علی جینا اور مسٹر بوس کے مختصر حالات مع تصاویر شایع کئے ہیں، کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۲۶ صفحات کو محیط ہے اور کتابت و طباعت بہت پاکیزہ ہے۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ:۔ دائرۂ ادبیہ، دریا گنج دہلی۔

قتیل و غالب

جناب سید اسد علی صاحب انوری فریدآبادی کی تصنیف ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُردو میں بالکل اچھوتی چیز ہے۔ اسوقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے محاسن سے متعلق تھا، لیکن اس تصنیف میں ان کی زندگی ان کے اخلاق، ان کی شاعری وغیرہ کے تاریک پہلو کو پیش کیا گیا ہے جس میں سب سے بڑے معرکہ کی چیز قتیل و غالب کی مخالفت ہے۔ فاضل مصنف نے کامل تحقیق و جستجو کے بعد بتایا ہے کہ غالب کے تمام اعتراضات لغو و مہمل ہیں اور خود ان کا کلام بھی اُن نقایص و معائب سے پاک نہیں جو انھیں دوسروں کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔

یہ کتاب مکتبۂ جامعہ ملیہ لکھنؤ سے ۸ر میں مل سکتی ہے۔

ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر

مقالہ ہے مولانا غلام یزدانی ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ حیدرآباد کا جو اُردو اکادمی جامعہ ملیہ کے سالانہ جلسہ میں انھوں نے پڑھا تھا، موضوع نام سے ظاہر ہے اور اس کی خوبی کے لئے مقالہ نگار کا نام کافی ضمانت ہے۔ اسکی قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ ملیہ لکھنؤ

تاریخ ہندوستان کی تمہید مقالہ ہے پروفیسر محمد مجیب صاحب جو اُردو اکادمی جامعہ ملیہ کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ یہ مقالہ مقدمہ ہے ایک مختصر تاریخ ہند کا جو عرصہ سے انکے زیر تالیف ہے۔ اس کی قیمت ۵ ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ لکھنؤ۔

محکومیت لنسواں ترجمہ ہے مِل کی مشہور تصنیف (Subjection of women) کا جس میں بتایا گیا ہے کہ عورت کو دنیا میں کس کس طرح محکوم بنایا گیا اور اس کی ذہنی آزادی چھیننے کے لئے مرد نے کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔ قیمت عہ ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ لکھنؤ

ہندستانی آل انڈیا ریڈیو نے پانچ حضرات سے اس موضوع پر تقریر کرائی تھی یہ انھیں تقریروں کا مجموعہ ہے جس میں ہر ایک نے اپنے نقطۂ نگاہ سے ہندوستانی زبان کے مفہوم کو پیش کیا ہے، مقررین کے نام یہ ہیں:۔ ڈاکٹر تاراچند۔ مولوی عبدالحق، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ پنڈت دتاتریہ کیفی۔ مسٹر آصف علی۔ مقررین کی تصویریں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ لکھنؤ۔

گئو دان ناول ہے منشی پریم چند مرحوم کا جو چھوٹی تقطیع کے ۶۵۱ صفحات کو محیط ہے اور مجلد شایع کیا گیا ہے۔ پریم چند کی کہانیاں اور ان کے ناول اس قدر مقبول و مشہور ہیں کہ ان پر اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ قیمت ع۱۲ اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ لکھنؤ۔

رسول پاک جناب عبدالواحد صاحب سندھی نے نہایت آسان زبان میں بچوں کے لئے یہ کتاب لکھی ہے اور خصوصیت کے ساتھ رسول اللہ کے اخلاق کو پیش کیا ہے۔ قیمت ۸ ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ لکھنؤ۔

دنیا کی کہانی مجموعہ ہے پروفیسر محمد مجیب صاحب کی سترہ تقریروں کا جو لاسلکی اسٹیشن دہلی سے مختلف اوقات میں نشر کی گئی تھیں۔ ان تقریروں میں دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں سے بحث کی گئی ہے اور فاضل مقرر نے اپنے دلچسپ انداز بیان میں گویا دنیا کی مختصر سی تاریخ پیش کر دی ہے۔ قیمت ۸ر اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ لکھنؤ۔

پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دیگئی تو آیندہ مہینہ کے اختر تک ۱ر کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے اور اُسکے بعد قیمتاً یعنی ۸ ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔ — منیجر نگار

مسلمان بچوں کے لئے اردو کی سب سے بہتر ریڈریں

نصاب مکاتب اسلامیہ

ہیں

۱- یہ ریڈریں اس خوبصورتی سے تیار ہوئی ہیں کہ ہر فرقہ کے مسلمان بلا امتیاز اسے پڑھاتے ہیں
۲- سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ کی طرف سے مکاتب اسلامیہ میں ۱۹۳۶ء سے رائج ہوئی ہیں اور
مکاتب اسلامیہ کے بچے خواہ سنی ہوں یا شیعہ یکساں طور پر پڑھتے ہیں۔
۳- ان کتابوں کا مؤلف ایک بلند پایہ ادیب اور ماہر تعلیمات ہے۔
۴- ان کتابوں کو ٹکسٹ بک کمیٹی نے اول نمبر پر پاس کیا ہے۔
۵- ان کتابوں میں مسلمانوں کی ضروریات کا تمام مواد موجود ہے۔
۶- مسلمان اپنے بچوں کے لئے ریڈروں میں جس قسم کا مواد چاہتے ہیں وہ سب انہیں موجود ہے
۷- صنعت و حرفت ایجاد و اختراع کے متعلق اسباق ہیں۔
۸- سیرۃ النبی صلعم پر ولولہ انگیز اسباق ہیں۔
۹- دینیات اور اخلاق کی باتیں اور موقعہ موقعہ سے دلچسپ اور سبق آموز نظمیں شامل ہیں۔
۱۰- دور موجودہ کی معلومات اور ضروریات پر بھی اسباق ہیں تاکہ بچے وقت سے بیخبر نہ رہیں۔
۱۱- اصلاح دیہات اور صحت وصفائی پر بہترین مضامین شامل ہیں۔
۱۲- ان چاروں حصوں میں متبرک نیز مسلمانوں کی مشہور یادگار عمارتوں کے حالات اور فوٹو بھی شامل ہیں۔
۱۳- لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ ٹائٹل موٹا اور مضبوط اور قیمت اسقدر کم کہ لاگت سے برابر
قیمت حصہ (۱) ۳ر حصہ (۲) ۴ر حصہ (۳) ۴ر حصہ (۴) ۴ر، تاجران کتب کو مناسب کمیشن

ملنے کا پتہ:- مینیجر صدیق بکڈپو لکھنؤ

خوشخبری

ہم کارخانہ کے سرپرستوں کو خوشخبری دیتے ہیں کہ ہمارے یہاں
اورینٹل امتحانات الہ آباد اور لکھنؤ یونیورسٹی نیز اعلیٰ قابلیت کی
تمام کتابیں مستند اور معتبر شرحیں، خلاصے اور متعلقہ تمام
امدادی کتابیں جو مقابلۃً سب جگہ سے عمدہ ہیں
موجود ہیں اور نسبتاً مناسب نرخ پر مہیا
کرتے ہیں، آپ لائبریری کی کتابوں کیساتھ
یہ بھی طلب فرما سکتے ہیں، اگر ضرورت ہو
تو ان امتحانات کی کتابوں کی
فہرست طلب فرمالیں،

مینیجر صدیق بکڈپو امین آباد پارک لکھنؤ